Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

یکم و ۱۶ دسمبر ۲۰۱۷ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۰ ۔ شمارہ نمبر: ۲۳۔۲۴

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ معارف فیچر ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ معارف فیچر کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ معارف فیچر کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

القدس: پس منظر اور صہیونی عزائم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مسجدِ اقصیٰ میں آتشزنی کی دلخراش خبر ہر مسلمان کے قلب و روح پر بجلی بن کر گری ہے اور صرف پاکستان ہی کے مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اٹھے ہیں۔ اس وقت بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ایک طوفان کی طرح اٹھ رہا ہے کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہے؟ یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ منحوس لمحہ ہماری زندگی میں پیش آیا۔ ستر پچھتر کروڑ مسلمان دنیا میں موجود ہیں (۱۹۶۹ء) اور پھر بھی یہودیوں کی یہ ہمت ہوئی کہ ہماری تین مقدس ترین مسجدوں میں سے ایک کو آگ لگا دیں۔ اُس مسجد کو پھونک ڈالیں جسے اسلام میں قبلۂ اول ہونے کا شرف حاصل ہے' جس کی طرف رخ کر کے رسول اللہ ﷺ نے ساڑھے چودہ برس تک نماز پڑھی ہے اور جس سے حضورؐ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے بڑی مصیبت امتِ مسلمہ کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے؟ جس مسلمان کے دل میں دین کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے' وہ سوچ رہا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو دنیا میں اس امت کی کیا آبرو باقی رہ جائے گی اور اس کے بعد ہمیں نہ معلوم اور کیسی ذلتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس معاملہ کی پوری نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں' کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اس جُرم کا اصل مُحرِّک کیا ہے؟

اسرائیل نے اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی پے در پے کوششیں کی ہیں اور اس کے لیے بڑے اوچھے طریقے اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ بجلی کے تاروں میں خرابی واقع ہونے سے اتفاقاً آگ لگ گئی۔ لیکن پھر خود ہی ان مجرموں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ اتنی بڑی عمارت میں محض بجلی کے تاروں کی خرابی سے ایسی خوفناک آتش زدگی آخر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد نہایت ڈھٹائی اور سخت بے حیائی کے ساتھ یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ عربوں نے خود آگ لگائی ہے۔ اس طرح کے جھوٹ کا ہم کو پہلے ہی کافی تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ کس قماش کے لوگ ایسے جھوٹ گھڑا کرتے ہیں۔ اس فلسفے کے اصل مصنف یہودی ہی ہیں۔ وہ یہودی دماغ ہی تھا جس نے اخلاق کا یہ اصول تصنیف کیا تھا کہ جس طریقہ سے بھی مقصد براری ہو سکے وہ برحق ہے۔ یہودیوں کو بہت جلدی یہ محسوس ہو گیا کہ یہ دروغِ بے فروغ بھی کارگر نہ ہوگا۔ اب ایک آسٹریلین نوجوان کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس دیوانے نے کسی جنون کے دورے میں یہ حرکت کر ڈالی ہے' ورنہ مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کرنے کا کوئی منصوبہ اسرائیل کے پیش نظر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نوجوان پر مقدمہ چلا کر اور اپنے ایک خودساختہ کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کرا کے وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کی پوری تاریخ بیان کر دوں' جس سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک بڑا طویل المیعاد منصوبہ ہے' جو صدیوں سے چل رہا ہے اور اسی کے تحت یہ کارروائی بطورِ تمہید کی گئی ہے۔

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل از مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے' جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتلِ عام کر کے اس سرزمین پر اُسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکا پر قبضہ کیا۔ اِن کا دعویٰ تھا کہ خدا نے یہ ملک اِن کی میراث میں دیدیا ہے' اس لیے اُنہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے بلکہ اُن کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔

اس کے بعد آٹھویں صدی قبل از مسیح میں اَسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ پھر

اندرونی صفحات پر:۔

- مسئلۂ فلسطین: جرمِ ضعیفی کی سزا
- میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!
- چین: توقعات اور خدشات
- انور سادات سے شاہ سلمان تک
- بھارت کی مغربی ایشیائی حکمت عملی!
- دہشت گردی کے خلاف اگلا مرحلہ
- نئی شاہراہِ ریشم: چین کے عزائم
- سعودی عرب: سرمایہ کاری کس قیمت پر؟
- ترجیحات
- یومِ شکست نہیں، یومِ تشکر
- طرفۂ معجونی

چھٹی صدی قبل از مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا' بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی' اور ہیکلِ سلیمانی (Temple of Solomon) کو جسے دسویں صدی قبل از مسیح میں حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا' اس طرح پیوندِ خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلا وطنی کے بعد ایرانیوں کے دورِ حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کی' لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔ ۷۰ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی' جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکلِ سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ء میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اِخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عرب قوموں سے آباد تھا' بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔ اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

۱) یہودی ابتداً نسل کُشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲) شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔ اور

۴) عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل از مسیح میں انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکلِ سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات بیس صدیوں سے بٹھائی جا رہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔

بارہویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعتِ یہود (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کو ازسرِ نو تعمیر کرے۔ مشہور فری میسن تحریک (Freemason Movement) بھی' جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں' اصلاً ایک یہودی تحریک ہے' اور اس میں بھی ہیکلِ سلیمانی کی تعمیرِ نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے۔ اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈرامہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکلِ سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکلِ سلیمانی کو تعمیر کرے اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ہیکلِ سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۱۹۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا' اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی مَعبد نہ تھا' بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے **مسجد الاقصیٰ** اور **قُبۃ الصَخرۃ** کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی مَعبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔ تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے' ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم و ستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوارِ گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں' یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیلی حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن (News From Israel) شائع ہوتا ہے۔ اس کی یکم جولائی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوارِ گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت' فیاضی اور حسنِ سلوک کا بدلہ آج اِس شکل میں اُن کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ اِن ظالموں نے کس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل (Theodore Hertzel) نے ۱۸۹۷ء میں صہیونی تحریک (Zionist Movement) کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکلِ سلیمانی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان وہاں زمینیں خریدیں اور منظّم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔ پھر ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خان' سلطانِ ترکی کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں' آپ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خان نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ ''جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے' اس وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں''۔ جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام تھا حاخام قرہ صو آفندی۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے

بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرأت کی کہ سلطانِ ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔ اسی پر بس نہیں' بلکہ سلطان عبدالحمید خان کا جواب سن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دیدی گئی کہ تم اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد ہی سلطان عبدالحمید خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہوگئیں' جن میں فری میسن' دُونمہ اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترک قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہوکر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سلطان عبدالحمید کو معزول کردیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان عبدالحمید کی معزولی کا پروانہ لے کر ان کے پاس گئے تھے ان میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآ فندی تھا' جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات برس ہی پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہوگی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

ترک اور عرب قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور وشور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی کی عثمانی سلطنت کے ٹکڑے اڑانا تھا۔ اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنا اسلامی اخوت کے بجائے ترک قوم پرستی پر رکھیں' حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے' بلکہ عرب اور کرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترک قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہوجائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عرب قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے' بیروت اس کا مرکز تھا اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے' دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔

جنگِ عظیم اوّل اور اعلان بالفور

پہلی جنگ عظیم میں ابتداً یہودیوں نے حکومتِ جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا' کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکا میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے قیصر ولیم (Kaiser Wilhelm) سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوادے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کرسکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا' وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کرسکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین (Dr.Weisman) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت وقابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے' اگر آپ ہم کو یہ یقین دلادیں کہ آپ فتحیاب ہوکر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنادیں گے۔ ڈاکٹر وائزمین ہی اُس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کرلیا جو اعلانِ بالفور (Balfour Declaration) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خودمختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین (حجاز کے حکمراں) کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کرکے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرادیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے کلنک کے اِس ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔

پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کردینے کا وعدہ کیا جارہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آرہی تھی۔ اعلانِ بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فیصد بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنتِ برطانیہ کا وزیر خارجہ (لارڈ بالفور) یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا' جو دنیا بھر میں انیس سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمہیں موقع دیں گے کہ عربوں کے جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے' اس سے تم انہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لاکر بسادو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے: ''ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صہیونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں''۔ اُس وقت کے برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of Birtish Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔

مجلس اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں ''مجلسِ اقوام'' (League of Nations) اور اس کی اصل کارفرما دو بڑی طاقتوں' برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں' بلکہ محض صہیونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلسِ اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے اِنتداب (Mandate) میں دے دیا جائے۔ اُس موقع پر فلسطین میں مردم شماری کرائی گئی تھی۔ اُس کے مطابق مختلف اقوام کا آبادی میں یہ تناسب تھا:

اقوام	تعداد	تناسب
مسلمان عرب	۶,۶۰,۶۴۱	۸۱ فیصد
عیسائی عرب	۷۱,۴۶۴	۹ فیصد
یہودی	۸۲,۷۹۰	۱۰ فیصد
کُل	۸,۱۴,۸۹۵	۱۰۰ فیصد

یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جاکر آباد ہورہے تھے۔ اس پر بھی مجلسِ اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ یہ اس کی ذمہ داری ہوگی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے' صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کرکے اسے نظم ونسق میں شریک کرے

اوراس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ یہ تھا اُس مجلسِ اقوام کا انصاف' جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لاکر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا' لیکن ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام ہی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلسِ اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے' جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے اِنتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی اِنتداب کا کارنامہ

یہ اِنتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لاکر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیموئیل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم ونسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کیے گئے' بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے' سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آکر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید براں ان کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔ ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نوآبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام قیمت لے کر پٹے پر دے دیے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے عرب گاؤں صاف کر دیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو آٹھ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو پچاس ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس تین پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صہیونیت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں' جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگِ عظیم دوم (۴۴-۱۹۳۸ء) کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صہیونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔ انگریزی اِنتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا' جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ''قومی وطن'' بنانے کے بجائے فلسطین میں ان کی ''قومی ریاست'' قائم کر دیں۔

''قومی وطن'' سے ''قومی ریاست'' تک

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلسِ اقوام (League of Nations) نے صہیونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اُس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین ''مجلسِ اقوامِ متحدہ'' (United Nations Organization) انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن وانصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی' اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیشن پاس ہو سکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکا نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہیٹی' فلپائن اور لائبریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکی کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے اور جیمز فوریسٹال (Forrestal) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (Scandal) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔''

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی' اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فیصدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو' اور ۴۵ فیصدی رقبہ ۶۷ فیصدی عرب آبادی کو دیا گیا' حالانکہ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فیصدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف!

لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے' آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب (A Study of History) میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔ دیریاسین میں ۹/اپریل ۱۹۴۸ء کے قتلِ عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے' جس میں عرب عورتوں' بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا' عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیریاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے' اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ''۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہو سکتا ہے جس میں رمق برابر بھی شرافت وانسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عین اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر پھر بحث کر رہی تھی' یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور سب سے پہلے امریکا اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا' حالانکہ اس وقت تک اقوامِ متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک چھ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل برخلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاستِ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردوپیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ لیکن یہودی اس وقت تک اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا' اس وقت فلسطین

کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر کے دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے' اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیہ سے آئے تھے۔ اقوامِ متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں' ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام' دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بیت المقدس اور باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحدِ شام کی بالائی پہاڑیوں (جولان) پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل کو پہنچا۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷,۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہو گیا اور چودہ پندرہ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکا اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید و حمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۱۹۵۵ء تک اعلانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں جب عرب ممالک اس بات سے بالکل مایوس ہو گئے کہ امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انہیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انہیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے اور ان کو اپنے دائرۂ اثر میں لانے کا موقع

مسئلۂ فلسطین: جرمِ ضعیفی کی سزا

سید شاہد ہاشمی

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے اس اعلان نے، دنیا بھر میں ایک بھونچال پیدا کر دیا ہے کہ امریکا کی نگاہ میں پورا یروشلم اسرائیل کا جائز دارالحکومت ہے۔۔۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ بھونچال کتنے روز رہتا ہے۔ اسرائیل بہرحال اپنے صہیونی منصوبوں کو مرحلہ وار آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مسلم دنیا، باہمی چپقلش اور استعماری قوتوں کی خوشامد میں لگی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آ سکے گی؟ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

اسرائیل کا ہمیشہ اصرار رہا ہے کہ بیت المقدس اس کے زیرِ انتظام رہے گا اور فلسطینیوں کا مطالبہ ہے کہ کم از کم اس کے مشرقی حصہ پر (جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں، اردن کے ہاتھوں سے نکل کر اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا تھا) فلسطینی کنٹرول ہونا چاہیے۔ اسی مشرقی بیت المقدس میں تقریباً ۳۵۔ ایکڑ رقبہ پر مشتمل وہ خطۂ زمین ہے جو **حرم الشریف** کے نام سے موسوم ہے اور جس کی حدود میں **مسجد الاقصیٰ** اور **قبۃ الصخرۃ** (پتھر والا گنبد) واقع ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نبیٔ آخر الزماں ﷺ نے معراجِ سمٰوٰت کا عظیم سفر کیا تھا اور جس کی طرف رخ کر کے تقریباً ۱۵ سال تک خود نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ نماز ادا کرتے رہے۔ اسی لیے اس کو قبلۂ اول کہا جاتا ہے۔ دنیا کی صرف تین مسجدوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے خصوصی طور پر جانا اور اُنہیں دوسری تمام مساجد پر فوقیت دینا جائز ہے۔ یہ تین مسجدیں **کعبۃ اللہ، مسجدِ نبوی** اور **مسجدِ اقصیٰ** ہیں۔

۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ء کو اسرائیلی انتہا پسند جماعت لیکوڈ پارٹی کے سربراہ (بعد میں اسرائیلی وزیراعظم بھی) ایریل شیرون نے حرم الشریف (مسجدِ اقصیٰ) کا دورہ کیا' جس پر فلسطینی مسلمانوں نے پُرامن احتجاجی مظاہرے کیے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مظاہرین کو گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد سے پورا فلسطین ایک بھٹی کی مانند سلگ رہا ہے۔ اہلِ فلسطین، دو بار انتفاضہ کے نام سے غیر معمولی تحریکِ آزادی چلا چکے ہیں۔ اس طرح محاصرہ کا شکار غزّہ بھی بار بار اسرائیلی عسکری جارحیت کا شکار ہوتا رہا ہے۔

اسرائیلی اس بات پر بضد ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ کی حدود میں ہیکل سلیمانی ضرور تعمیر کریں گے۔ متحدہ یروشلم (بیت المقدس) کو اپنا دارالحکومت بنائے رکھیں گے۔۔۔ اور امریکا سمیت ساری دنیا کے سفارت خانوں کو، تل ابیب سے یروشلم منتقل کروائیں گے۔ دوسری طرف یہودیوں کو اس بلاجواز کارروائی سے روکنے کے لیے مسلمان بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اب تک کئی ہزار افراد اسرائیلی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں اور ہزارہا مکانات مسمار کیے جا چکے ہیں اور نہیں معلوم کہ یہ سلسلہ کہاں تک پہنچے گا۔ پوری دنیا کی نگاہیں بیت المقدس میں جاری کشمکش پر مرتکز ہیں۔

دریں حالات ہمارے ہاں امریکی اشارے پر' اور ریاستی اداروں پر قابض طاقتور حلقوں کی آشیرواد سے یہ بحث چھیڑی جاتی رہی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ہمارا اسرائیل سے کیا جھگڑا ہے؟ اب تو بہت سی عرب حکومتوں نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے یا کرنے والی ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ عربوں نے کب ہمارا ساتھ دیا کہ اب بھی ہم ان کی وجہ سے اسرائیل سے دشمنی مول لیے رہیں۔ اُس سے ہماری دشمنی کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ اسرائیل اور بھارت دوست بنے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو ہم بھی اس کے دوست بن سکتے اور بھارت سے اس کی قربت کو کم کر سکتے ہیں۔

یہ دلائل سادہ دل اور معاملے کے تاریخی' واقعاتی' ایمانی' اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں سے ناواقف لوگوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا معاملہ محض ایک ملک کو ماننے یا نہ ماننے کا نہیں۔ اسرائیل یہودیوں کا جبری طور پر حاصل کردہ نسلی وطن اور عالمگیر صہیونی تسلط کا نقطۂ پرکار ہے۔ حق و باطل کی ازلی کشمکش میں سے پچھلے ۳۔۴ ہزار سال کے سیکڑوں خم دار پہلو اس سے وابستہ ہیں' جنہیں ہوش و حواس میں رہنے والا کوئی باغیرت مسلمان نظرانداز نہیں کر سکتا۔

بیت المقدس کی اہمیت اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اس پر اسرائیلی اور عرب دعوؤں میں حقیقت کتنی ہے؟ اور اس حوالے سے صہیونی عزائم اور منصوبے کیا کیا ہیں؟ مسئلۂ فلسطین کی نزاکت اور اس کے ایمانی پہلوؤں سے ہی نہیں' واقعاتی اور تاریخی حقائق سے بھی روشناس ہونا ضروری ہے۔

|||

مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہوسکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاتے' البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن اور الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہوگیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدت میں امریکا نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زفرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوامِ متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کرسکی۔ نومبر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوامِ متحدہ کی ۲۸ قراردادیں وہ اس کے منہ پر مار چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء سے نومبر ۱۹۶۶ء تک سات مرتبہ اقوامِ متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قراردادیں پاس کیں' مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا تو اُس وقت اسرائیل کے وزیراعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ ''اگر اقوامِ متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے' تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔'' یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ امریکا اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر مارتا ہے اور پوری اقوامِ متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکا کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے' اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین جنرل وہیلر نے صدر لِنڈن بی جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہوسکے اور انہوں نے سی آئی اے کے سربراہ رچرڈ ہیلمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کے بعد اسرائیل پر ''وحی'' نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکی چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد سنڈے ٹائمز لندن نے ایک کتاب شائع کی تھی' جس کا نام تھا The Holy War-June 1967 اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے' اس کا عنوان رکھا گیا ہے Back After 896 Years' یعنی ''۸۹۶ برس بعد واپسی''۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا' نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال بھی یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا' اسی کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کو کرائی گئی تھی کہ بھارت بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا۔ عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک سفارتکار کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔'' یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہوگیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے' جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ نوے سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزا دو ہیں۔ ایک یہ کہ **مسجد الاقصیٰ** اور **قُبّۃ الصَخرۃ** کو ڈھا کر ہیکلِ سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے' کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ اُس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزا کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جز کا تعلق ہے' اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکا کو دنیائے اسلام کے شدید ردِعمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیرِ نو اُن کا مسیح ہی آ کر کرے گا۔ جب تک وہ نہ آ جائے' ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو جدّت پسند ہے' اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں' کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ پر قبضہ ہوجانے کے بعد ہم دورِ مسیحائی (Messianic Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربّی (Chief Rabbi) نے توراۃ ہاتھ میں لے کر اُس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ ''آج ہم ملتِ یہود کے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں''۔ انہی دو وجوہ سے مسجدِ اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔

دوسرا جز اس منصوبے کا یہ ہے کہ ''میراث کے ملک'' پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

''اے اسرائیل' تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں''۔

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا ارادہ عین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صہیونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے' اس کی رو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر' پورا اردن' پورا شام' پورا لبنان' عراق کا بڑا حصہ' ترکی کا جنوبی علاقہ' اور جگر تھام کر سنئے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے' اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ موثر ثابت نہ ہوسکا' تو پھر خاکم بدہن ایک دن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں گے۔

پس چہ باید کرد؟

اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیش نظر مسئلے کی پوری نوعیت' نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے' اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

اول یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور ان کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکا کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے' وہ کسی بڑے سے بڑے جرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔ سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ قراردادیں پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔ چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے بائیس سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آ جانے کے بعد نہ صرف مسجدِ اقصیٰ' بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے' اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدّسہ کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے ہیں کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے' مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں' یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔ اب مسجدِ اقصیٰ کے سانحہ کے بعد' خدا کا شکر ہے کہ ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ صہیونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ۔۔۔ جب کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید و حمایت بھی اس کو حاصل ہے۔۔۔ تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ یہودی ایک طاقت ہیں تو ستر پچھتر کروڑ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں اور ان کی تیس بتیس حکومتیں اس وقت (۱۹۶۹ء) انڈونیشیا سے مراکش اور مغربی افریقا تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا' ان شاء اللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو' اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلانِ بالفور (Balfour Declaration) سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے' صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں' انہیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور ظلم و جبر کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا ''قومی وطن'' بنایا' پھر اسے ''قومی ریاست'' میں تبدیل کیا اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا' بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا ہے کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی ایک کھلی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے۔ عالمِ اسلام کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بننی چاہیے' جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عرب عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو ''قومی وطن'' اور پھر ''قومی ریاست'' بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔

اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکا۔۔۔ جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر' ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے۔۔۔ تو اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اُس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو روئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اُس کے لیے کوئی ادنیٰ درجہ کا بھی جذبۂ خیرسگالی باقی رہ جائے۔ اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔

(واضح رہے کہ یہ خطاب ۲۴ اگست ۱۹۶۹ء کو لاہور میں اُس وقت کیا تھا' جب یہودی سازش کے تحت ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجدِ اقصیٰ کو آگ لگا کر' شہید کر دیا گیا تھا۔۔۔ ادارہ)

| | |

بقیہ: طُرفۂ معجونی

صفحہ اس عقیدۂ توحید کے ابلاغ سے خالی نہیں اور خود رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور اسوہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں توحید کی تلقین و تعلیم نہ ہو۔ اوپر جن تین شخصیات کا ذکر ہوا ہے ان کی جلالتِ علمی کو ہم سلام پیش کرتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دین کو مدرسہ و خانقاہ کی تنگنائیوں سے نکال کر اگر کسی نے اسے اس کی کامل صورت میں دنیا کے سامنے رکھا تو دین کی کوئی صدیوں پر محیط اجنبیت کے بعد یہ کارنامہ بیسویں صدی میں آ کر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ادھر عالمِ عرب میں حسن البناء شہیدؒ نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ علم و عشق اور عقل کی دنیا یہ بھول ہی چکی تھی کہ یہ دین ایک نظامِ زندگی اور ضابطہ حیات ہے۔ یہ تقریباً ساتھ ساتھ برپا ہونے والی وقت کی سب سے بڑی ان اسلامی تحریکوں نے دین کی اس حقیقی صورت کو اجاگر کیا۔ ہماری نگاہ میں تو حسن البناءؒ اور مودودیؒ سے بڑھ کر کوئی عاشقِ رسولؐ نہیں ہے۔ پچھلی زوال زدہ کئی صدیوں کا اس امت پر قرض تھا جو دین نبیؐ کا سچا کھرا تصور اجاگر کر کے انہوں نے چکایا۔ سارے عالم اور سارے عاشق مل کر بھی کریں تو ان کے احسان کا بدلہ نہیں دے سکتے۔ شعر و ادب اور فکر و فلسفہ کے آمیزے سے الجھی ہوئی بے ترتیب باتوں اور عبارتوں کا طُرفۂ معجونی تیار کرنے والوں کو اس زاویے سے غور کرنا چاہیے کہ سطورِ بالا میں جن تین جزیروں کا ذکر ہوا' سید مودودیؒ اور حسن البناءؒ کی ذات میں جمع ہو کر عقل، علم اور عشق باہم ایک ہو گئے ہیں۔

| | |

احمد حاطب صدیقی کے شوخ اور شگفتہ قلم سے!

whit\AJ_Nadvi_
book_cover_ocher.jpg not found.

قیمت: ۴۰۰ روپے

ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰

''شکستِ آرزو'' سے ایک باب

میرے آغاز میں میرا انجام پوشیدہ ہے!

پروفیسر سیّد سجاد حسین
سابق وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی وڈھاکا یونیورسٹی

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بارے میں جس قدر بھی غور کیجیے، ذہن اسی قدر الجھتا جاتا ہے۔ میں خانہ جنگی کے دوران رونما ہونے والے سفاک حالات کی بات نہیں کر رہا اور نہ یہاں فوجی حکمتِ عملی پر بحث مقصود ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کے ذہنوں سے پاکستان کی اہمیت کا تصور اس قدر تیزی سے کس طرح کھرچ کر پھینک دیا گیا۔ ہمارے لیے پاکستان ایک بنیادی ضرورت تھا، مگر حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ ہمیں اس بنیادی ضرورت کے احساس سے ہی غافل کر دیا گیا۔ عوامی لیگ پورے مشرقی پاکستان پر اثرات نہیں رکھتی تھی۔ مگر ۱۹۷۱ء کے حالات نے اسے ایسی پوزیشن کا حامل بنا دیا کہ کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہ رہا۔ جو لوگ عوامی لیگ سے اختلاف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے اندر اس اختلاف کو برملا ظاہر کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ عوامی لیگ کے بعض مخالفین نے صورت حال کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا پینترا بدلا کہ وہ صوبائی مفادات کے تحفظ کا چیمپئن بننے کے معاملے میں عوامی لیگ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلتے دکھائی دیے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں ڈھاکا کی سڑکوں پر نوجوان مارچ کرتے ہوئے یہ نعرہ لگاتے تھے کہ انہیں اسلام آباد کے شکنجے سے نکالا جائے! لوگوں کو کس طرح اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کی زندگی اور اس کے تمام معاملات اسلام آباد یعنی پاکستانی حکمرانوں کے شکنجے میں ہیں۔ ہوسکتا ہے لوگوں کو خود بھی معلوم نہ ہو کہ یہ احساس کیونکر پیدا ہوا۔ دوسری طرف سرحد پار بھارت میں باغیوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جارہی تھی۔ انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ جابر پاکستانی حکمرانوں کے خلاف وہ جو کچھ بھی کریں گے، اس میں انہیں بھارتی حکومت اور میڈیا کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے ماضی میں ہندوؤں کے ہاتھوں بہت سی مشکلات سہی تھیں، مگر سب کچھ بھول کر وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ آزاد بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ بھارت کی مدد سے بھرپور ترقی کریں گے اور خوش حال زندگی بسر کریں گے۔ ہم جیسے لوگ، جو عوامی لیگ کے ساتھ نہ تھے، حالات کا رُخ دیکھ کر صرف حیران اور پریشان ہی ہوسکتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے خطے (مشرقی پاکستان) نے جس سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی عصر حاضر کی تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہے یا نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے بنگال کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ تقسیم مسلمانوں کے مطالبے پر عمل میں آئی تھی۔ انگریزوں کے نزدیک اس فیصلے کی حیثیت انتظامی سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر انگریزوں نے ہندوؤں کے دباؤ میں آکر ۱۹۱۱ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا تھا۔ مشرقی بنگال اور آسام کے علاقوں کو ملا کر جو انتظامی یونٹ تشکیل دیا گیا تھا، اس کی ترقی کے امکانات دیکھ کر ہندوؤں نے انگریزوں کو ورغلایا اور مغربی بنگال میں ممکنہ خرابی سے ڈرا کر انہیں یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کیا۔ بنگال میں مشرقی اور مغربی کی تقسیم کوئی نئی بات نہیں۔ یہ طویل داستان ہے، اس کی ایک تاریخ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی دونوں خطوں میں بہت فرق ہے۔ مشرقی بنگال دریائی علاقہ ہے۔ یہاں موسم غیر معمولی طور پر مرطوب رہتا ہے اور ہر سال سیلاب اور سمندری طوفان سے تباہی مچتی رہتی ہے۔ دوسری جانب مغربی بنگال میں موسم خشک اور غیر مرطوب رہتا ہے۔ شہری آبادی زیادہ ہے۔ صنعتی ڈھانچا مضبوط ہے۔ انگریزوں نے جب مغلوں کو شکست دی تو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے انہوں نے کلکتہ کو دارالحکومت بنایا۔ ہندو اور انگریز دونوں ہی مسلمانوں سے مخاصمت رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ہوگئے اور کلکتہ کے ہندوؤں نے انگریز حکومت کے ایوانوں میں گہرا اثر و رسوخ پیدا کرلیا۔ ہندوؤں نے کلکتہ میں دارالحکومت ہونے کا خوب فائدہ اٹھایا۔ مغربی بنگال میں صنعتوں کا جال بچھا دیا گیا اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی اسی علاقے میں قائم کیے گئے۔

انگریزوں نے ۱۹۱۱ء میں بنگال کی انتظامی تقسیم ختم تو کردی، مگر انہوں نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ وہ ڈھاکا میں یونیورسٹی تعمیر کردیں گے۔ ہندوؤں سے یہ بھی برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے انگریزوں کو ورغلانا شروع کر دیا کہ ڈھاکا میں یونیورسٹی کے قیام سے کلکتہ میں یونیورسٹی کی تعلیم اور آمدنی متاثر ہوگی۔ کانگریس کے ایک وفد نے اس سلسلے میں وائسرائے سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ ڈھاکا میں یونیورسٹی کا قیام کوئی منفعت بخش فیصلہ نہ ہوگا، کیونکہ وہ ایک پسماندہ علاقہ ہے اور جہاں یونیورسٹی قائم کی جارہی ہے وہاں ناخواندہ لوگ رہتے ہیں۔ ہندو مسلم تاریخ اور دوطرفہ کشیدگی کے پیش نظر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو کن حالات کا سامنا تھا۔ ہندوؤں نے ایک طرف تو مشرقی اور مغربی بنگال کی تقسیم ختم کروا کر مسلمانوں کو پہنچ سکنے والے ممکنہ فوائد سے محروم کروا دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی سازش بھی جاری رکھی!

ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی۔ ہندوؤں نے حسد کے مارے اسے مکہ یونیورسٹی قرار دیا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لیے بنگالی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سکھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ابتدا میں عملے کے بیشتر ارکان ہندو تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے شعبوں کے علاوہ دیگر شعبوں میں بڑے لمبے عرصے تک صرف چار یا پانچ ہی مسلم اساتذہ تھے۔ بنگالی میں ڈاکٹر شہیداللہ، تاریخ میں اے ایف رحمٰن، انگریزی میں ایم حسن اور ریاضی میں قاضی مطاہر حسین تھے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے قیام کے سترہ سال بعد ۱۹۳۸ء میں جب ہم نے یونیورسٹی میں قدم رکھا، اس وقت بھی صورتحال زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس وقت ڈاکٹر شہیداللہ تو تھے، مگر اے ایف رحمٰن ریٹائر ہوکر جاچکے تھے اور ان کی جگہ محمود حسین آئے تھے۔ انگریزی میں ایک نوجوان جلال الدین احمد کو کلاس ٹو کا لیکچرر مقرر کیا گیا تھا۔ معاشیات میں مظہرالحق تھے اور سیاسیات میں عبدالرزاق نئے بھرتی ہونے والے اساتذہ میں سے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ڈھاکا یونیورسٹی میں تاریخ کے شعبے سے چند ماہ کے لیے وابستگی اختیار کی اور پھر مستعفی ہوکر چلے گئے۔ شعبۂ سائنس میں قاضی مطاہر حسین واحد مسلم لیکچرر تھے جنہیں کلاس ٹو کا گریڈ دیا گیا تھا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں مسلم اساتذہ کی شدید قلت تھی اور یہ کسی سازش کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ حقیقتاً مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خال خال تھے۔ خالی اسامیوں پر بھرتی کے لیے لوگ نہیں ملتے تھے۔ جبکہ ہندو امیدوار بہتر قابلیت کے حامل ہوتے تھے اور ان میں نظم وضبط بھی ہوتا تھا۔ تعلیم و تعلم کے معاملے میں ان کا رویہ خالص پیشہ ورانہ تھا۔ یونیورسٹی کی گورننگ باڈی، جسے ایگزیکٹو کونسل کہا

جاتا تھا، کے مسلم ارکان کو جلال الدین احمد کے تقرر کے لیے بہت زور لگانا پڑا تھا، کیونکہ ان کے پاس سیکنڈ کلاس ڈگری تھی۔ عبدالرزاق ہندو اور مسلمان، دونوں ہی کے لیے دردِ سر تھے۔ ان کے اطوار غیر روایتی تھے اور ان میں نظم وضبط کا بھی فقدان تھا۔ فرائض سے غفلت برتنا ان کی عادت تھی۔ وہ ہندوؤں کی تنقید کا نشانہ بنتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے حوالے سے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مظہرالحق نے کئی مواقع پر یونیورسٹی کے تسلیم شدہ قواعد کو ماننے سے انکار کیا۔ ان کا گورننگ باڈی سے بار بار تنازع کھڑا رہتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ڈھاکا یونیورسٹی میں کسی مسلم کلرک کے تقرر کو بھی مسلمان اپنی بڑی کامیابی تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ڈھاکا یونیورسٹی ایک چھوٹا سا ادارہ تھی۔ طلبا کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ تین ہاسٹلوں میں سے ایک رہائشی ہال مسلمانوں کے لیے مختص تھا اور دوسرا ہندوؤں کے لیے۔ تیسرا ہال کسی کے لیے مختص تو نہ تھا، تاہم اس میں ہندو زیادہ تھے۔ مسلمانوں کے لیے سلیم اللہ ہال اور ہندوؤں کے لیے جگن ناتھ ہال مختص تھا۔ کاسموپولیٹن ہال کا نام ڈھاکا ہال پڑ گیا تھا، جسے بعد میں ڈاکٹر شہیداللہ سے موسوم کر دیا گیا۔

۱۹۴۰ء کے بعد مسلم طلبا کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اب ان کے لیے ایک اور ہال مختص کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جب یہ معاملہ صوبائی کابینہ میں منظوری کے لیے پیش ہوا تو وزیرِ خزانہ نالنی رنجن سین نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ایک اور کاسموپولیٹن ہال بنایا جائے۔ جبکہ خواجہ ناظم الدین نے ہال کو مسلمانوں کے لیے مختص کرنے پر زور دیا۔ بہرحال یونیورسٹی کی عمارت میں پہلی منزل پر ایک ہال کو عارضی طور پر خالی کر کے، اس وقت کے وزیرِاعلیٰ اے کے فضل الحق کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ جسے بعد میں مستقل ہال کے طور پر موجودہ نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک کا زمانہ داخلی اور خارجی اعتبار سے شدید مشکلات سے پُر تھا۔ ہندوستان کے بڑے حصے پر کانگریس کی حکومت تھی اور اس کے اندازِ حکمرانی نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے سیاسی طور پر ساتھ رہنا کسی طور ممکن نہیں۔ مسلمانوں کو بار بار باور کرایا جا رہا تھا کہ انگریز کے جانے کے بعد اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو انہیں اپنی جداگانہ تہذیبی شناخت ختم کرنا پڑے گی۔ مسلمانوں کی بنیادی زبان اردو خطرے میں تھی۔ مسلمانوں کے لیے آزادانہ طریقے سے عبادت ناممکن بنا دی گئی تھی۔ وِدیا مندر رایجوکیشن اسکیم کے تحت مسلم طلبا کو ہندو بنانے کی سازش کی گئی۔ ان تمام مسائل کا حل کیا تھا؟ چند آئینی اصلاحات؟ کوئی اس بات پر کس طرح یقین کر سکتا تھا کہ اقتدار پر مکمل قابض ہونے کے بعد کانگریس مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرے گی، جبکہ فوج پر بھی اُسی کا کنٹرول تھا؟ یہ وہ پس منظر تھا جس میں علیحدگی کی بات کی جانے لگی تھی، مگر ہمیں خود بھی اندازہ نہ تھا کہ آگے چل کر یہ مطالبہ کیا شکل اختیار کر لے گا۔

بین الاقوامی سطح پر یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں ہٹلر کا عروج، اسپین میں خانہ جنگی اور وسطی یورپ کا سیاسی وسفارتی بحران دنیا کو ایک بار پھر بھرپور تصادم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہٹلر کی جانب سے معاہدوں کا عدم احترام، جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنا، یہودیوں کو مظالم کا نشانہ بنانا اور نسل پرستی سے متعلق نت نئے نظریات کا پرچار تہذیب اور شائستگی کے لیے، سولہویں صدی کے بعد شاید سب سے بڑا دھچکا تھا۔ اٹلی نے ایبی سینا (موجودہ ایتھوپیا اور قرب وجوار) پر لشکر کشی کر کے ثابت کر دیا تھا کہ لیگ آف نیشنز کسی کام کی نہیں اور یہ بین الاقوامی تنازعات روکنے یا ختم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اٹلی کے مسولینی کے مقابلے میں جرمن ایڈولف ہٹلر لیگ آف نیشنز کے لیے زیادہ تیزی سے موت کا باعث بن رہا تھا۔

مشرقِ بعید کی صورت حال بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ جاپان نے چین کے خلاف جارحیت جاری رکھی ہوئی تھی۔ وہ پورے مشرقی ایشیا پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ جاپانی استعماریت بین الاقوامی سطح پر خرابی پیدا کر رہی تھی۔ ہم اس زمانے میں طالب علم تھے۔ ہمیں جس قدر یورپ کے بارے میں معلوم تھا، اتنا مشرقِ بعید کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ اخبارات میں بھی یورپ میں ہونے والے واقعات کو زیادہ اور نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

ہمارے لیے خبروں کا ایک بڑا ذریعہ کلکتہ سے شائع ہونے والا اخبار ''دی اسٹیٹس مین'' (The Statesman) تھا۔ یہ ''ٹائمز آف لندن'' کی طرز پر شائع ہوتا تھا۔ اس کے ادارتی عملے میں یورپی باشندے شامل تھے۔ اس لیے اس کا معیار بھارت کے دیگر انگریزی اخبارات سے خاصا بہتر تھا۔ مسلمانوں کے قابل ذکر اخبارات برائے نام ہی تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اواخر میں ''دی اسٹار آف انڈیا'' کے نام سے شام کو چھپنے والا ایک روزنامہ جاری کیا تھا۔ لیکن اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کوئی بھی تعلیم یافتہ مسلمان نہ مل سکا تھا۔ تب ہی جنوبی ہندوستان کے ایک عیسائی پوتھن جوزف کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ بنگالی زبان میں مولانا اکرم خان کا اخبار ''آزاد'' ۱۹۳۶ء سے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہا تھا۔ اس کی سرکولیشن محدود تھی اور اس میں بین الاقوامی خبروں کی اشاعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ''دی آنند بازار پتریکا''، ''دی امرت بازار پتریکا''، ''فارورڈ''، ''جگانتر'' اور دیگر ہندو روزنامے دن رات مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کو دی جانے والی معمولی سی رعایت بھی ان اخبارات سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ اس پر تنقید کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اگر اسٹیبلشمنٹ میں مسلمانوں کو کوئی بڑا منصب مل جاتا تھا تو اس کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا جاتا تھا اور اسے فرقہ واریت اور اقربا پروری کا نام دے دیا جاتا تھا۔ وزیرِاعلیٰ اے کے فضل الحق بیوروکریسی اور حکومتی مشینری کے کل پرزوں میں ہندو مسلم توازن برقرار رکھنے کے لیے چند مسلمانوں کو بطور کلرک بھی بھرتی کر لیتے تھے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

بنگال میں ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے بعد مسلم لیگ کی وزارت نے حالات کچھ بہتر بنائے۔ ورنہ اس سے پہلے تو مسلمانوں کو سرکاری ملازمت کے حصول میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسلم گریجویٹ بے روزگار رہا کرتے تھے۔ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ایک مسلم نوجوان، میرے عزیز، خان بہادر ایم اے مومن سے ملنے آیا، جو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اعلیٰ حلقوں میں ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اُس نوجوان نے بتایا کہ فرسٹ کلاس ڈگری حاصل کرنے کے باوجود اسے ملازمت نہیں ملی۔ وہ اس بات پر تاسف کا اظہار کر رہا تھا کہ اس نے تعلیم پر خواہ مخواہ وقت اور وسائل ضائع کیے۔

سیاسی اعتبار سے بھی معاملات مایوس کن تھے۔ ہندو بہت اچھی سیاسی پوزیشن میں تھے اور وہ مسلمانوں کو اس میں کوئی حصہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو صوبائی مقنّنہ میں اقلیت کی حیثیت سے رہنے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ رمزے میکڈونلڈ (Ramsay Macdonald) نے جس کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تھا، رابندر ناتھ ٹیگور جیسی بلند پایہ ہستی نے بھی اس کی مذمت کی تھی۔ کمیونل ایوارڈ کا بنیادی مقصد بنگال میں اقلیتوں کو بھی سیاسی امور میں آواز اٹھانے کا

موقع دینا تھا۔ کانگریس نے اس ایوارڈ کو انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول کا حصہ گردانا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ نچلی ذات کے ہندوؤں کو بھی ووٹ ڈالنے اور صوبائی مقنّنہ میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اختیار دے دیا گیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے عشرے سے کچھ قبل میری اپنی سوچ یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ نمائندگی کا حق یا متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کوئی آئینی فریم ورک کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں علیحدگی کے بارے میں سوچنا شروع نہیں کیا تھا، اور نہ مسلم لیگ کی جانب سے الگ وطن کے قیام کا مطالبے کی حمایت شروع کی تھی۔ محمد علی جناح کی شخصیت بھی ہمارے لیے خاصی متاثر کن تھی۔ تاہم آزادی یا علیحدگی کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں تھیں اور ہم اس بارے میں ابہام کا شکار تھے۔ مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کے حوالے سے پنڈت جواہر لعل نہرو سے محمد علی جناح کی بحث نے ہم میں خاصا ولولہ پیدا کیا تھا۔ نہرو کا موقف تھا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ کانگریس اور انگریز۔ محمد علی جناح نے جواب میں کہا کہ فریق تو چار ہیں۔۔ انگریز، ہندو، مسلمان اور آزاد ریاستیں (رجواڑے)۔ پریس میں مسلم اور ہندو حقوق کے حوالے سے گرما گرم بحث ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سامان تھی۔ اُس وقت میں خاصا الجھا ہوا تھا کیونکہ کوئی حتمی حل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری ذہنی الجھن اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک مرحلے پر میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر ہم مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں رہنا ہے تو ہمیں علیحدہ ثقافتی اور مذہبی شناخت کا تصور ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ انہی دنوں مسلمانوں کے لیے ایک علیٰحدہ وطن کے قیام کی بات کی جانے لگی۔ اس مطالبے نے مجھ میں عجیب جوش وخروش بھر دیا۔ انہی دنوں روزنامہ دی اسٹیٹسمین میں ایک تجزیہ کار الکھ دھاری نے لکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ناقابل قبول ہے، کیونکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان اس قدر یکجان ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی معمے (Puzzle) کے حصوں کی طرح تقسیم کیے بغیر الگ کرنا ممکن نہیں۔ میں نے ''دی اسٹیٹس مین'' کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا، جس میں بتایا کہ الکھ دھاری کا تجزیہ کیوں غلط ہے اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں درست ہے۔ میں نے اس وقت تک یونیورسٹی کی پہلی ڈگری بھی حاصل نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہ احساس ہی غیر معمولی مسرت کا مآخذ تھا کہ میں مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس خط کی کاپی میں نے سنبھال کر رکھی تھی جو ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ میں نے اس خط میں کشمیر اور حیدرآباد کے علاوہ مسلمانوں کی علیحدہ ریاست میں مسلم اکثریت کے حامل بھوپال، یوپی اور سی پی کے علاقوں کو بھی شامل کرنے کی بات کہی تھی۔ مجھے اس خط کی تاریخ تو اچھی طرح یاد نہیں تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ ہندوستان سے الگ ہونے کی صورت میں مسلمان آزاد ریاست یا ریاستوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو کس طرح منظّم کریں گے، زندگی کس طور بسر کریں گے۔ میں اور میرے ساتھی یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان سے الگ ہونے والے مسلم اکثریتی علاقے آزاد ریاستوں کی حیثیت سے قائم بھی رہ پائیں گے یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ وہ آپس میں اتحاد قائم کریں گے یا نہیں۔ جیسے ہی علیحدگی کی بات کھل کر کہی جانے لگی، ہم نے سکون کا سانس لیا کہ ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں سے نجات کی یہی ایک صورت ہے۔

| | |

بقیہ: ترجیحات

میں ایک اہم معرکہ درپیش ہے۔ اہلِ سیاست اس سے بے خبر ہیں۔ اہلِ صحافت کی ترجیحات دیکھنا ہوں تو ٹاک شوز اور کالموں کے موضوعات پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

علم کی دنیا میں فتویٰ سازی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ علم کبھی فتوے کی زبان میں گفتگو نہیں کرتا۔ شاید اسی لیے ہماری روایت میں مفتی کا منصب علم کے دیگر شعبوں سے الگ رکھا گیا۔ علم کی دنیا میں مکالمہ ہوتا ہے۔ اختلاف ہو تو استدلال کیا جاتا ہے اور فیصلہ اہلِ علم اور وقت کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ علم حاکم ہو تو سیاست کے موضوعات بھی بدل جاتے ہیں۔

جرمنی بھی ان دنوں ایک سیاسی بحران کا شکار ہے۔ وہاں بھی مذہبی گروہوں کے اختلاط کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں اس مسئلے پر الگ سے لکھوں گا۔ اس وقت سفر کا صرف یہ تاثر بیان کرنا مقصود ہے کہ ہم بحیثیت قوم تعمیری ایجنڈے سے کوسوں دور ہیں۔ ہم ابھی تک یہ بھی دریافت نہیں کر سکے کہ علم کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ ہماری ترجیحات تو دوسری ہیں۔ جب سفر کا رُخ ہی درست نہ ہو تو منزل کی امید کیسی؟

(بشکریہ: روزنامہ ''دنیا'' کراچی۔ ۲۵ نومبر ۲۰۱۷ء)

بقیہ: سعودی عرب: سرمایہ کاری کس قیمت پر؟

ایک پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ سعودی عرب میں چین کی سرمایہ کاری ایران کو چینی قیادت سے برافروختہ کر سکتی ہے۔ چین کو اس حوالے سے بہت محتاط ہو کر چلنا ہوگا۔

چینی قیادت کو چند ایک معاملات میں الجھنوں کا سامنا ہے۔ اندرونی قرضوں کا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بیرون ملک بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری چینی قیادت کے لیے کسی بھی اعتبار سے کوئی آسان کام نہیں۔ ویسے بھی چین نے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیئیٹو کے ذریعے پاکستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں ۱۰۰/ارب ڈالر سے زائد سرمایہ کاری کا وعدہ کر رکھا ہے۔ صرف پاکستان میں سی پیک کے حوالے سے چین ۵۰/ارب ڈالر سے زائد کی سرمایہ کاری کرنے کا خواہش مند دکھائی دیتا ہے۔

نوم پروجیکٹ جیسی بہت بڑے پیمانے کی معاشی و مالیاتی مہم جوئی کے لیے ولی عہد محمد بن سلمان نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ بہت حد تک خطرناک ہے۔ مالدار شخصیات کو حراست میں لے کر ان سے سرمایہ نکلوانا بیرون ملک بہت سے سرمایہ کاروں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ نوم پروجیکٹ کی کامیابی کے لیے سعودی عرب میں سیاسی استحکام لازم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اعتماد کی فضا پیدا کرنا بھی ناگزیر ہے۔ ان دو شرائط کی عدم تکمیل سے نوم پروجیکٹ کی کامیابی کے امکانات دھندلا جائیں گے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"When the Saudis need cash".
("The Globalist". November 23, 2017)

| | |

بقیہ: نئی شاہراہِ ریشم: چین کے عزائم

قورغاس اس وقت کسی صحرا کا نہیں بلکہ تعمیرات اور صنعت کے ایک مرکز کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ Guo کہتا ہے، ہمارا اگلا قدم اپنی صلاحیتوں کو ذرائع آمدورفت میں مزید بہتری، معلومات کا بہترین نظام وضع کرنے، معاشی اصلاحات کے ساتھ ساتھ سیاحت اور ہوائی اڈے کی تعمیر بھی ہے۔ اس سے چھوٹے شہروں اور قصبوں، جو قورغاس کے مشرق ومغرب میں واقع ہیں، کے خوابوں کی تکمیل ہوگی اور سیاحت فروغ پائے گی۔ (ترجمہ: محمد آصف)

"Big Plans for China's New Silk Road".
("Time". May 18, 2017)

| | |

چین: توقعات اور خدشات

James M. Dorsey

چین کے ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کا اہم حصہ پاکستان سے گزرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کے ہراول دستے کی حیثیت رکھنے والا منصوبہ چین پاک اقتصادی راہداری (سی پیک) پاکستان اور چین دونوں ہی کے لیے بہت اہم ہے۔ پاکستان کے لیے یہ اس لیے اہم ہے کہ اس کی بدولت معیشت تبدیل ہوجائے گی، ملک تیزی سے ترقی کرنے کے قابل ہوجائے گا، بہت بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ ملک کے پس ماندہ علاقوں کو اس عظیم منصوبے سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ دوسری طرف چین کے لیے بھی یہ منصوبہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کی کامیابی ہی سے دوسرے منصوبوں کو بروقت شروع کرنے اور ان پر تیزی سے کام کرنے کی تحریک مل سکے گی۔

مغرب کے تجزیہ کار پاکستان اور چین کے مابین بڑھتے ہوئے اشتراکِ عمل کے حوالے سے خدشات پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔ مغربی میڈیا میں ایسا بہت کچھ آرہا ہے، جو شکوک وشبہات پیدا کرنے کے مقصد کے تحت ہے۔ ایسا ہی ایک ''چشم کشا'' تجزیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔)

.....

پاکستان کو چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو میں کلیدی کردار حاصل ہے تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان میں چین کے نوآبادیاتی عزائم کے حوالے سے تشویش پائی جاتی ہے، بالخصوص قدرتی وسائل تک زیادہ سے زیادہ رسائی کے حوالے سے۔

چین کے معاشی عزائم کے لیے ایک چیلنج کے روپ میں پاکستان اور نیپال نے ڈیم کی تعمیر کے دو منصوبوں سے اپنے آپ کو الگ کرنے کو ترجیح دی ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے وقت ہورہا ہے جب پاکستان میں چین کے حوالے سے چند ایک خدشات ضرور پائے جاتے ہیں، خاص طور پر نوآبادیاتی انداز سے قدرتی وسائل تک زیادہ سے زیادہ رسائی اور انہیں حاصل کرنے سے متعلق۔

چین کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی بھی معاہدے میں تمام فریقین کو زیادہ سے زیادہ فوائد سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے۔ چینی خارجہ پالیسی میں اسے win-win اصول کا نام دیا گیا ہے یعنی ایسا معاہدہ جس میں کسی بھی فریق کے کسی بھی مفاد کو داؤ پر لگانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ چینی قیادت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی سرمایہ کاری کرتی ہے وہاں فریق ثانی کو بھرپور طور پر پنپنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے میں ڈیم کے منصوبوں سے پاکستان اور نیپال کا الگ ہوجانا کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ ناقدین اور تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ چین کی نظریں پاکستان کے قدرتی وسائل پر ہیں۔ وہ پاکستان سے گرینائٹ، بلیک ماربل اور دوسرا بہت کچھ نکالنا چاہتا ہے۔ سری لنکا اور قرضوں میں ڈوبے ہوئے دوسرے بہت سے ممالک البتہ چین کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے سامنے اور کوئی راستہ بھی نہیں۔

گزشتہ ماہ دیامر بھاشا ڈیم کے منصوبے میں چین سے اشتراکِ عمل ختم کرنے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے واٹر اینڈ پاور ڈیولپمنٹ اتھارٹی (واپڈا) کے سربراہ مزمل حسین نے بتایا کہ چین نے جو شرائط رکھی ہیں، وہ کسی بھی اعتبار سے قابل قبول نہیں کیونکہ وہ پاکستان کے بنیادی مفادات کے برخلاف ہیں۔

گلگت بلتستان میں بھارت کے زیر انتظام کشمیر سے کچھ ہی فاصلے پر ۱۴/ارب روپے کی لاگت سے ۴۵۰۰ میگاواٹ کے پن بجلی گھر کی تعمیر پر بھی پاکستان اور چین کے درمیان بات بگڑی۔

پاکستان کے فیصلے سے دو دن قبل نیپال کے نائب وزیراعظم اور وزیر توانائی کمل تھاپا نے ڈھائی ارب ڈالر کی لاگت سے چین کے گیزوبا گروپ کے اشتراکِ عمل سے ایک پن بجلی گھر قائم کرنے کے معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔

نیپال میں انتخابات کا دوسرا مرحلہ ۷ دسمبر کو ہے۔ اگر نیپالی کانگریس اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب رہی تو ڈھائی ارب ڈالر کا یہ منصوبہ گریٹر یوریشیا گیم کے حوالے سے کلیدی حیثیت اختیار کرجائے گا۔

دیامر بھاشا ڈیم سی پیک کا اہم حصہ تھا۔ چین نے پاکستان میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر وترقی کے حوالے سے بہت سے وعدے کیے ہیں۔ گوادر کی بندرگاہ بھی چین کی تیار کردہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو کے حوالے سے سی پیک کے منصوبے کلیدی کردار ادا کریں گے۔ چین نے پاکستان میں پچاس ارب ڈالر سے زائد سرمایہ لگانے کے معاہدے کیے ہیں۔ کسی بھی ایک ملک کے لیے یہ چین کی سب سے زیادہ سرمایہ کاری ہوگی۔

دیامر بھاشا ڈیم کے معاملے میں چین سے بات کا بگڑ جانا ایسی بات نہیں جو آسانی سے نظرانداز کردی جائے۔ اس منصوبے کے لیے عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک سمیت تمام بڑے عالمی مالیاتی اداروں نے کچھ لگانے سے معذرت کرلی تھی۔ اس کا بنیادی سبب بھارت کی طرف سے تحفظات کا اظہار تھا کیونکہ یہ ڈیم متنازع علاقے میں قائم کیا جارہا تھا۔

پندرہ برس میں دیامر بھاشا ڈیم پر کام پانچ مرتبہ شروع ہوکر رک چکا ہے۔ واپڈا کے چیئرمین مزمل حسین کہتے ہیں کہ اب اس منصوبے کے لیے پانچ سالہ فنڈنگ کا شیڈول مرتب کیا گیا ہے اور یہ منصوبہ ۲۰۲۶ء میں مکمل ہوجائے گا۔

چین کے تجزیہ کار کہتے ہیں کہ ڈیم کی تعمیر کے منصوبوں سے نیپال اور پاکستان کا الگ ہوجانا، ایک بڑی مثال قائم کردے گا۔ شنگھائی انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اسٹڈیز میں جنوبی ایشیا کے امور کے ماہر ژاؤ گین چینگ کہتے ہیں ''چینی قیادت کو یہ بات کسی بھی حال میں نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ کسی بھی معاہدے میں فریق ثانی اُسی وقت دلچسپی لے گا جب اُسے اس بات کا یقین ہوگا کہ یہ اس کے لیے کسی بھی اعتبار سے خسارے کا سودا نہیں۔ جو کچھ اس وقت ہوا ہے وہ مستقبل میں بھی دیگر چینی منصوبوں کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ عالمی سطح پر ایک تاثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ چین کے لیے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور یہ کہ وہ اس منصوبے کو ہر قیمت پر مکمل کرے گا۔ ٹھیک ہے مگر ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کسی بھی منصوبے میں شامل ہونے والا ہر فریق اپنے مفادات کا تحفظ بھی چاہے گا۔ چین کے لیے ممکن نہیں کہ دوسروں کے مفادات کو یکسر نظرانداز کرے''۔

چین بیشتر منصوبوں کے حوالے سے جو مالیاتی شرائط عائد کررہا ہے ان کے حوالے سے بھی اور کسی بھی منصوبے کے حقیقی معاشی فوائد کے حوالے سے بھی متعلقہ ممالک کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ پاکستان کی ماربل انڈسٹری کے لیے چین ایک نئی منڈی ہے اور اس میں پاکستانیوں کے لیے خاصی کشش ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ چین کو پاکستانی ماربل کی منڈی بنانے سے پاکستان کو شدید نقصان کا سامنا ہے۔ پاکستان سے جو ماربل چین کو برآمد کیا جاتا ہے وہی ماربل تھوڑی سی پروسیسنگ

کے بعد پاکستان کو واپس بھیجا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان میں ماربل انڈسٹری متاثر ہورہی ہے۔

ماربل کے ایکسپورٹر اور ریٹیلر شکیل خان نے ایشیا ٹائمز کو بتایا کہ چین کے خریدار ماربل کے بڑے، چوکور ٹکڑے خریدنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں بیشتر خریدار بیضوی شکل کے ٹکڑے خریدتے ہیں، جو بعد میں مزید کئی ٹکڑوں میں کاٹ کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ چینی خریدار جس طرح کے ٹکڑے چاہتے ہیں اُن کے حصول کے نتیجے میں ان کانوں سے ماربل نہیں خریدا جاتا جہاں ماربل میں دراڑیں پڑ گئی ہوں۔

پشاور میں سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر زاہد شنواری نے بتایا کہ چینی خریدار بازار سے صرف کمیاب قسم کا اور معیاری مال مثلاً اونیکس، بلیک گولڈ ماربل اور انتہائی اعلیٰ معیار کا گرینائٹ خریدتے ہیں۔ نیز یہ کہ پاکستان میں ماربل انڈسٹری کے پاس ماربل کو بہترین فنشنگ دینے کے لیے مطلوب ہائی ٹیک مشینری دستیاب نہیں۔

معاشی بالادستی

پاکستان کی ماربل انڈسٹری کا معاملہ بتاتا ہے کہ آگے چل کر پاکستان میں چین کا عمل دخل غیر معمولی حد تک بڑھ جائے گا۔ ایک طرف تو پاکستان کی معیشت متاثر ہوگی اور دوسری طرف ثقافتی اثرات بھی مرتب ہوں گے۔ میڈیا کے میدان میں بھی چین کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکیں گے۔ یہ خدشہ بھی پروان چڑھ رہا ہے کہ چین کو پاکستان میں نگراں ریاست کی سی پوزیشن حاصل ہوجائے گی۔ پاکستان کا ہر اہم معاملہ اس کی گرفت میں ہوگا۔

چینی منصوبوں کے حوالے سے سری لنکا، میانمار اور پاکستان میں بلوچستان کی حد تک مزاحمت پائی جاتی ہے۔ چین کے عظیم منصوبے میں سرکاری شعبے کی بہت سی کمپنیوں کے ذریعے پاکستان میں ہزاروں ہیکٹر اراضی پر نئے بیجوں کی آزمائش سے آبپاشی کے جدید ترین نظام تک بہت سے تجربات شامل ہیں۔ چینی کمپنیوں کو بہت سی چینی وزارتوں اور چائنا ڈیولپمنٹ بینک کی طرف سے فراخ دلانہ قرضے اور سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔

چین کے درجنوں تجارتی اور صنعتی ادارے پاکستان میں بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ لائیو اسٹاک اور ٹیکسٹائل کے شعبے میں سرمایہ کاری کے خواہش مند ہیں اور دوسری طرف وہ پریسیشن اریگیشن کے حوالے سے بھی بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان ویلیو ایڈیڈ اشیا تیار کرنے والے ملک کے بجائے محض خام مال فراہم کرنے والا ملک بن کر رہ جائے گا۔

پاکستان میں ایک بڑی ٹیکسٹائل اور گارمنٹ انڈسٹری موجود ہے مگر چین چاہتا ہے کہ اپنے شورش زدہ صوبے سنکیانگ میں اوغور نسل کے مسلمانوں میں شورش پسندی ختم کرنے کے لیے وہاں ٹیکسٹائل کی صنعت کو فروغ دے۔ اس صنعت کے لیے خام مال پاکستان فراہم کرے گا۔ ویلیو ایڈیشن کا کام سنکیانگ کے مسلمان کریں گے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو محض خام مال برآمد کرنے والے ملک کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ یہ سب کچھ چین کے عظیم منصوبے کے مندرجات میں شامل نکات ہیں۔

ڈیم کے منصوبوں سے پاکستان اور نیپال کا الگ ہوجانا اس بات کا اشارا ہے کہ چین کو کسی بھی معاہدے کے تمام فریقوں کے لیے مساوی معاشی فوائد کا اہتمام کرنا ہوگا۔ ایسا کیے بغیر اُس کے لیے بھرپور انداز سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوسکے گا۔

انڈونیشیا کے اخبار جکارتہ پوسٹ نے سال رواں کے اوائل میں اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا کہ چین اگر عالمی سیاست و معیشت کے حوالے سے تیزی سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسے لازمی طور پر اپنا وژن واضح کرنا ہوگا اور متعدد ممالک کے عوام میں پائے جانے والے خدشات سے متعلق وضاحت بھی کرنا ہوگی تاکہ مزاحمت کا عنصر کم سے کم سطح پر رہے اور مل جل کر کام کرنے کی راہ ہموار ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

James M. Dorsey متعدد ایوارڈ حاصل کرنے والے صحافی اور اسکالر ہیں۔ وہ سنگاپور کے ایس راجارتنم اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے سینئر فیلو اور یونیورسٹی آف ووئرزبرگ کے انسٹی ٹیوٹ آف فین کلچر کے شریک ڈائریکٹر ہیں۔)

"Pakistan: Where China hits a wall".
("The Globalist". November 30, 2017)

بقیہ: بھارت کی مغربی ایشیائی حکمت عملی!

عمومی طور پر مغربی ایشیا اور خاص طور پر خلیجِ فارس مودی حکومت کی خارجہ پالیسی کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ لیکن اب تعلقات کی نوعیت تبدیل ہوچکی ہے ماضی میں ان حکومتوں سے تعلقات کی وجہ محصولات اور تیل وگیس کی سپلائی تھی اور اب ان تعلقات کی بڑی وجہ بڑے پیمانے پر کی جانے والی سرمایہ کاری اور سمندری سیکورٹی ہے۔ (ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Think west to go west: Origins and implications of India's West Asia policy under Modi (Part II)". ("mei.edu". Sep. 26, 2017)

بقیہ: یوم شکست نہیں، یوم تشکر

انتظامیہ ناکام ہوئی، عدلیہ نے اس معاملے کو بھی عدالتی فعالیت کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی، جس سے معاملہ الٹا الجھ گیا۔ پارلیمان بھی زیادہ فعال کردار ادا نہ کرسکی۔ سیاسی جماعتیں گومگو کی کیفیت میں رہیں، عوام بھی دم بخود بیٹھے رہے۔ اس سب کچھ کے ساتھ مگر سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ ایسا اس لیے ہوا کہ بنیادی ایشو ختم نبوت ﷺ کا تھا۔ ہر مسلمان کے لیے اپنی جان، مال، اپنے ماں باپ، اولاد سب سے زیادہ افضل اور محبوب جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات ہے۔ اس ایشو کے تقدس اور احترام میں پارلیمان کی جماعتیں، سیاسی اور عوامی حلقے ایک سائیڈ پر رہے۔ مولانا خادم رضوی کے ساتھ دھرنے کے آخری لمحوں تک دو تین ہزار لوگ ہی رہے، باقی لوگوں نے ان کے طریقہ کار سے اختلاف کے باعث ان کے ساتھ شامل ہونے سے گریز کیا، اگرچہ وہ ان کے مقاصد سے متفق تھے۔ یہ وہ نزاکت ہے جسے سمجھنا چاہیے۔ عمران خان یا اپوزیشن کی دیگر جماعتوں نے اس نازک موقع کو حکومت کے گرانے کے لیے استعمال نہیں کیا، اس پر انہیں سراہنا چاہیے۔ فوج نے مسئلہ کا حل نکالا، حالانکہ مظاہرین کو اشتعال دلایا جاتا تو سول حکومت کو دبانے بلکہ گرانے کا سنہری موقع تھا، جس سے فوج نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ پاکستانی ریاست کا کردار مجموعی طور پر تسلی بخش رہا۔ کچھ غلطیاں اور کمزوریاں رہیں، مگر بہرحال فساد پھیلنے کا موقع نہیں دیا گیا اور پُرامن حل نکال لیا گیا۔ یہ یوم شکست کے بجائے یوم تشکر ہے۔ فتح خادم رضوی کی نہیں ہوئی، بلکہ ختم نبوت ﷺ کے ایشو کی ہوئی۔ ایسے معاملات میں شکست کھانے والے، سر جھکانے والے سرخرو تصور ہوتے ہیں، ناکام نہیں۔ ہم کیا اور ہماری عزت کیا؟ شان، عزت، وقار اور تقدس سب اس کالی کملی والے ﷺ کو زیب دیتا ہے، ہماری جانیں، مال، اولاد، سب اللہ کے آخری رسول ﷺ پر قربان۔

(بشکریہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ یکم دسمبر ۲۰۱۷ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

بچوں کے ذہنی امراض

(۱۶ سال تک کی عمر کے بچوں کے ذہنی ونفسیاتی امراض ومسائل کا مختصر جائزہ)

فوزیہ عباس

قیمت: ۳۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

انور سادات سے شاہ سلمان تک

مردان بشارہ

چند ہفتوں کے دوران سعودی عرب اور اسرائیل سیاسی تجزیوں اور قیاس آرائیوں کا گرما گرم موضوع رہے ہیں۔ کوئی بھی دن ایسا نہیں گزرتا جب ان کے حوالے سے کوئی نہ کوئی ایسی بات سنائی نہ دیتی ہو، جس سے ان کے ارادوں اور اقدامات کا پتا نہ چلتا ہو۔

میں نہیں جانتا کہ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے حال ہی میں تل ابیب کا خفیہ دورہ کیا ہے یا نہیں مگر ہاں سعودی عرب اور اسرائیل کے سابق انٹیلی جنس سربراہوں کو نیویارک کے ایک سائنا گوگ (یہودی معبد) میں ایک ہی اسٹیج پر بیٹھے ہوئے میں نے ضرور دیکھا ہے۔ اس تقریب میں سابق سعودی انٹیلی جنس چیف شہزادہ ترکی الفیصل نے موساد کے سابق سربراہ افرائیم ہالیوی سے ایران کے معاملے پر شدید اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ افرائیم ہالیوی نے ''جوہری ایران'' کو برقرار رکھنے کے حق میں رائے دی۔ سعودی عرب چونکہ اس وقت ایران کو جوہری معاملات سے دور رکھنے کے لیے مہم چلا رہا ہے اس لیے شہزادہ ترکی الفیصل کے لیے ناگزیر تھا کہ اسرائیلی رائے کے خلاف جاتے۔ اور وہ گئے۔ جب کوئی اسرائیلی اسپائی ماسٹر کسی مسلم ملک کے معاملے میں غیر معمولی اعتدال کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے ''فیلو مسلم نیشن'' قرار دے تو لوگوں کا حیران اور متوجہ ہونا حیرت انگیز نہیں۔

شہزادہ ترکی الفیصل نے سوئس شہر ڈیووس میں عالمی اقتصادی فورم کے اجلاس میں بھی سابق اسرائیلی وزیر خارجہ زیپی لونی سے بعض معاملات پر بحث و تمحیص کی۔ اسرائیلی سفارت کاروں سے سعودی ہم منصبوں کا یوں غیر رسمی طور پر ملنا اور متنازع امور پر بات کرنا حیرت انگیز ہے۔ اب بحرین اور متحدہ عرب امارات بھی اس عمل میں شریک ہیں۔ یہ سب کچھ یقینی طور پر اس لیے ہے کہ اسرائیل سے باضابطہ تعلقات استوار کرنے کے حوالے سے عرب دنیا کے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔

وہابیوں اور صہیونیوں کا یوں نزدیک آنا کئی پہلوؤں سے ''حلال'' بھلے ہی نہ ہو، تاہم یہ نیا ہے نہ حیرت انگیز۔ سعودی عرب اور اسرائیل کے لیے اب بھی ایک دوسرے میں کچھ خاص کشش نہیں۔ یہ دونوں اگر قریب آرہے ہیں تو اس لیے نہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے کچھ لگاؤ ہے بلکہ محض اس لیے کہ دونوں کا خوف مشترکہ ہے۔ اس خوف کو ایران کہتے ہیں۔ ایران کا جوہری پروگرام اسرائیل اور سعودی عرب دونوں ہی کے لیے انتہائی تشویش کا باعث ہے۔ دونوں طرف یہ ڈر ہے کہ ایران خطے میں غیر معمولی پوزیشن حاصل نہ کرلے، اس کے اثرات کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوجائے کہ اسے کنٹرول کرنا مشکل ہوجائے۔ یہ خوف جس قدر پروان چڑھتا جارہا ہے، اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان تعلقات بھی اُسی رفتار سے پروان چڑھتے جارہے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوا کرتا ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے لیے سعودی عرب اور اسرائیل کے درمیان رابطے قلبی تسکین کا باعث ہے۔ مئی میں سعودی عرب کے دورے کے بعد سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اُن میں اسرائیل اور سعودی عرب کا نمایاں طور پر قریب آنا بھی شامل ہے اور یہ تبدیلی ٹرمپ کو زیادہ بھائی ہے۔ ایران کا جوہری پروگرام امریکا کے لیے بھی تشویش کا باعث تو ہے۔

سعودی عرب کے جریدے ''الف'' سے حالیہ انٹرویو میں اسرائیلی فوج کے چیف آف اسٹاف گادی آئزن کوٹ نے کہا ہے کہ ایران جو کچھ کر رہا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ وہ ایک طرف تو عراق، شام اور لبنان میں قدم جما چکا ہے اور دوسری طرف یمن میں بھی اس کے واضح اثرات ہیں، جس کے نتیجے میں ایک طرف بحیرۂ روم میں ایرانی اثرات نمایاں ہیں اور دوسری طرف بحیرۂ احمر بھی اس کے اثرات کے دائرے سے باہر نہیں رہا۔

سعودی عرب سے تعلقات استوار کرنے کے معاملے میں اسرائیل زیادہ بے صبرا ہوا جارہا ہے۔ ایک زمانے سے وہ اس بات کا خواہش مند رہا ہے کہ سعودی عرب میں اعتدال پسند اور لبرل قسم کی سُنی حکومت ہو اور اب اس کا یہ خواب بہت حد تک شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

سعودی عرب سے تعلقات استوار کرنے کے عمل میں اسرائیل کے لیے کوئی بھی معاملہ خسارے کا نہیں۔ اگر وہ سعودی عرب سے باضابطہ سفارتی تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو مسلم دنیا میں اس کے لیے بہتر تعلقات کے کئی دروازے کھل جائیں گے۔ عرب دنیا میں اس کے لیے قبولیت کی راہ ہموار ہوگی اور دیگر خطوں کے مسلم ممالک بھی اس سے باضابطہ تعلقات استوار کرنے میں زیادہ قباحت محسوس نہیں کریں گے۔ ۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدے کے بعد مسلم دنیا میں اسرائیل کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا تھا، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اردن اور قطر سے تعلقات قابلِ رشک حد تک بہتر بنائے تھے۔ قطر نے البتہ ۲۰۰۹ء میں غزہ کی ناکہ بندی کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اس کا تجارتی دفتر بند کردیا تھا۔

سعودی عرب اور اسرائیل کے درمیان قربت یوں بھی فطری ہے کہ اُن کے مفادات اور اسٹریٹجک اہداف بہت حد تک مشترک ہیں۔ اسرائیل کے وزیر توانائی یووال اسٹینز نے حال ہی میں بتایا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان انٹیلی جنس شیئرنگ ایک زمانے سے جاری ہے اور یہ بات چھپانا اسرائیل کے لیے نہیں بلکہ سعودی عرب کے لیے زیادہ ضروری تھا، تاکہ اسلامی دنیا میں آبرو محفوظ رہے۔

سعودی عرب نے ۲۰۰۲ء میں امن قائم کرنے کی نئی کوشش کے طور پر اسرائیل سے تعلقات صرف اس شرط پر بہتر بنانے پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ فلسطین اور دیگر عرب علاقوں سے قبضہ ختم کرے اور عسکری مہمات سے گریز کرے۔

اسرائیل سے تعلقات کے معاملے میں سعودی عرب کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے کیونکہ سعودی قیادت اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلامی دنیا میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے عمومی ذہن اب تک نہیں بن سکا ہے۔ سعودی عرب کا سخت جان حلیف متحدہ عرب امارات بھی اسرائیل کے معاملے میں بہت محتاط رہتا ہے اور اسرائیلی تجزیہ کاروں کے الفاظ میں کہیے تو وہ اب تک ''سائلنٹ پارٹنر'' رہا ہے۔

نئی قیادت، نئی پالیسی

اسرائیل سے تعلقات بہتر بنانے کے معاملے میں سعودی عرب کیا چاہتا ہے؟ یہ بات سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ سعودی عرب کی نئی قیادت بہت سے معاملات میں نئی سوچ اپنا رہی ہے۔ نئے اہداف مقرر کیے جارہے ہیں۔ نئی پالیسیاں مرتب کی جارہی ہیں۔ ''الف'' کے حالیہ شمارے میں شائع ہونے والے انٹرویو میں اسرائیلی فوج کے چیف آف اسٹاف یووال آئزن کوٹ سے فلسطین کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا گیا۔ اِسے محض کوتاہی یا صرفِ نظر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سب کچھ ارادی طور پر تھا۔ اتنا اہم معاملہ نظر

انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر کیا گیا۔ ایسا کرنے کے سیاسی مقاصد ہوں گے۔ ذہنوں میں سوالوں کا ابھرنا لازم ہے۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ ایران کو کنٹرول کرنے میں معاونت کے عوض سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے فلطسین کے معاملے پر سمجھوتہ کرلیا ہے؟

سعودی عرب اور اسرائیل دونوں ہی اس وقت امریکی صدر ٹرمپ کی طرف سے فلسطین کے معاملے پر کسی واضح رائے کے منتظر ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹرمپ اسرائیل سے کہیں گے کہ وہ مشرقی بیت المقدس سے انخلا کرے یا پھر فلسطینیوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے علاقوں سے اسرائیلی قبضہ ختم کرنے اور ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے مطالبے سے دست بردار ہوجائیں؟

معاملات آسانی سے نمٹتے دکھائی نہیں دیتے۔ ایک صدی پرانے قضیے کو طے کرانے کے لیے صدر ٹرمپ نے کسی اور کو نہیں، اپنے داماد جیرڈ کوشنر کو مقرر کیا ہے، جو جذباتی قسم کا صہیونی ہے۔ جیرڈ کوشنر کا وائٹ ہاؤس کیریئر زیادہ دیر چلتا دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ ایف بی آئی کے سابق سربراہ جیمز کومے کو ہٹانے اور امریکی صدارتی انتخاب میں روس کی تکنیکی مداخلت کے حوالے سے اسپیشل کاؤنسل رابرٹ ملر اُن کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ رابرٹ ملر اس امر کا بھی جائزہ لے رہے ہیں کہ اوباما دور میں جیرڈ کوشنر نے فلسطینی علاقوں میں غیر قانونی یہودی بستیوں کی تعمیر کے حوالے سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں رائے شماری کے دوران امریکا کی پوزیشن کمزور کرنے کے لیے اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو سے ساز باز کی تھی۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امریکی قیادت فلسطین کا مسئلہ حل کرنے کے حوالے سے قابل عمل اور قابل قبول تجاویز سامنے لانے اور یہودیوں کو فلسطینی علاقوں پر قبضہ کرنے سے روکنے میں ناکام ثابت ہوگی۔ دوسری طرف وہ ایران کے حوالے سے بھی کامیاب ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ایران اس وقت مشرق وسطیٰ کے بیشتر حصوں میں اپنے قدم جما چکا ہے اور ایسے میں اس کے خلاف کوئی واضح اقدام بظاہر امریکا کے بس کی بات نہیں۔

ایرانی قیادت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کے لیے سعودی عرب کو کچھ کرنے کی ضرورت ہے، نہ اسرائیل کو۔ اس کے لیے تو امریکی قیادت کا ایک اشارہ کافی ہے۔ سعودیوں کو بہت جلد اندازہ ہوجائے گا کہ ایران کو کنٹرول کرنے کے معاملے میں اسرائیل کو ساتھ ملانے سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا اور دوسری طرف ایران پہلے سے زیادہ مضبوط ہوکر ابھرے گا۔ اسرائیل کبھی، کسی بھی حالت میں سعودی عرب کی جنگ نہیں لڑے گا۔ سعودی عرب کو جو کچھ بھی کرنا ہے خود کرنا ہے۔

شاہ سلمان اسرائیل سے تعلقات بہتر بنانا چاہتے ہیں مگر انہیں اندازہ نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوسکتا ہے۔ ریاض میں اسرائیلی پرچم کے بلند ہونے سے پہلے انہیں انور سادات کا انجام بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔ سعودی عرب فلسطینی علاقوں سے یہودیوں کے انخلا کا مطالبہ منوانا چاہتا ہے نہ اُسے امریکا سے امداد درکار ہے۔

انور سادات نے چار عشروں پہلے کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل سے امن معاہدہ کیا۔ اس سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ انہوں نے مصر کے علاقے سینائی کا قبضہ واپس لینے اور امریکا سے اربوں ڈالر کی امداد کی شرط رکھی۔ انور سادات نے اسرائیل سے معاہدے میں دیگر تمام مقبوضہ عرب علاقوں کا معاملہ یکسر نظر انداز کیا۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ انور سادات دو سال بعد قتل کردیے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ عوام کی توقعات کے خلاف تھا۔

انور سادات کے جانشین حسنی مبارک نے تین عشروں تک مصر پر حکومت کی۔ اس دوران انہوں نے اسرائیل سے کیے ہوئے معاہدے پر عمل جاری رکھا۔ سینائی کا علاقہ مصر کو لوٹا دیا گیا۔ امریکا سے جی بھر کے امداد بھی ملتی رہی۔ مگر مصریوں کو کیا ملا؟ ملک جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوا نہ معاشرے میں کھلے پن کا ماحول ہی پیدا ہوسکا۔ ذرائع ابلاغ پر پابندیاں عائد رہیں۔ مصر کے عوام کے معیارِ زندگی میں ایسی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی جس کی بنیاد پر کہا جاسکے کہ اسرائیل سے معاہدہ کوئی فائدے کی چیز تھا۔ مصری معاشرے میں اسرائیل کے لیے شدید نفرت کے جذبات ہمیشہ موجود رہے۔ فلسطین کے کاز کو بھی مصریوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

مصر سے امن معاہدے کا سب سے زیادہ اور بھرپور فائدہ اسرائیل کو پہنچا۔ جنوبی سرحدوں کے محفوظ ہوجانے پر اسرائیل نے فلسطینیوں کو کچلنے کا عمل تیز کردیا۔ زیادہ سے زیادہ فلسطینی اراضی پر یہودی بستیوں کی تعمیر یقینی بنائی گئی۔ مسلم دنیا کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے اسرائیلی قیادت نے فلسطینیوں کو کچلنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اسرائیل کی قیادت نے آج تک وہی کچھ کیا، جو اس نے چاہا ہے۔ اس نے کبھی اسلامی ممالک کے ردعمل کی پروا نہیں کی۔ ۱۹۸۱ء میں گولان کی مقبوضہ پہاڑیوں کو اسرائیلی قیادت نے ملک کا باضابطہ حصہ بنالیا۔ ۱۹۸۲ء میں لبنان کے فلسطینی کیمپوں پر حملے کیے، جن میں بہت بڑے پیمانے پر شہادتیں ہوئیں۔ عراق کے جوہری ری ایکٹر کو تباہ کیا۔ جنوبی لبنان سے مزاحمتی تحریک کا خاتمہ کرنے کے بعد اسرائیل نے وہاں اٹھارہ سال تک قبضہ برقرار رکھا۔ جب اسرائیل نے مشرق وسطیٰ میں من مانی کا سلسلہ دراز کیا تو امریکا نے اسے علاقائی اتحادی سے ترقی دے کر گلوبل اسٹریٹجک پارٹنر بنالیا۔

چالیس سال قبل حماس تھی نہ حزب اللہ۔ القاعدہ تھی نہ داعش۔ جس طور افغانستان پر سابق سویت یونین کی لشکر کشی نے اسلامی شدت پسند پیدا کیے بالکل اُسی طور اسرائیلی پالیسی کے بطن سے فلسطینی مجاہد تنظیمیں بھی پیدا ہوئیں۔

عرب دنیا کے حکمران جس طور معاملات کو معمول پر لانا چاہتے ہیں، وہ غلط ہے۔ معاملات کو معمول پر لانے کے معاملے میں دکھائی جانے والی کمزوری امن کے معاملے میں دکھائی جانے والی قوت کے برعکس ہے۔ فلسطینی کاز کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ ایسے میں کسی بھی معاملے کو ہمیشہ کے لیے پرسکون اور نارمل بنانے کا خواب کیوں کر شرمندۂ تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ فلسطین کا معاملہ اہلِ عرب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہا ہے کیونکہ یہ جغرافیے یا نسل سے زیادہ ضمیر کا معاملہ ہے۔ فلسطینی کاز کے حوالے سے دکھائی جانے والی جذباتی وابستگی اس بات کی مظہر ہے کہ ضمیر ابھی زندہ ہے۔ اس کاز کو نظر انداز کرکے مشرق وسطیٰ میں حقیقی امن یقینی نہیں بنایا جاسکتا۔

حال ہی میں قاہرہ میں جن طاقتوں نے سلامتی کے معاملات پر تبادلہ خیال کیا، وہ دراصل وہی ہیں جنہوں نے اسرائیل سے انٹیلی جنس شیئرنگ تک کی ہے۔ ان کی نااہلی نے امریکا، اسرائیل اور ایران کو پورے خطے میں بے لگام ہوکر کچھ بھی کرگزرنے کا بھرپور موقع فراہم کیا ہے۔

جب یہ پورا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور شور وشغف کی گرد بیٹھے گی تب مؤرخ یہ بات درج کرے گا کہ عرب دنیا نے فلسطین کی قیمت پر اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کے لیے جو کچھ کیا وہ محض خسارے کا سودا تھا۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Sadat to Salman: Israel at the expense of Palestine". ("Al-Jazeera". Nov. 23, 2017)

| | |

بھارت کی مغربی ایشیائی حکمت عملی!

Pramit Pal Chaudhuri

مودی کا دورۂ متحدہ عرب امارات تعلقات کے فروغ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ مودی حکومت اب اپنے معاشی منصوبوں کی تکمیل کے لیے مغربی ایشیا کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔ بھارت کے ایک سینئر سفارت کار کا کہنا ہے کہ ''خلیج فارس ہمارے لیے اب صرف توانائی کے حصول کا ذریعہ نہیں رہا، بلکہ اس سے بڑھ کر سرمایہ کاری کا ایک ذریعہ بن چکا ہے''۔ اور اگر اس حوالے سے دیکھا جائے تو ابوظہبی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ بھارتی سرکاری اہلکار کا کہنا ہے کہ آنے والے سالوں میں جیسے جیسے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں، متحدہ عرب امارات بھارت کو خطے کا اہم ملک بنانے کے لیے درکار حمایت فراہم کرے گا۔ ماضی میں بھارت نے ایسی توجہ صرف امریکا اور جاپان پر دی۔

اگست ۲۰۱۶ء کو وزیر خارجہ سشما سوراج نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ''اگر آپ ہمارے پچھلے دو سال کی سفارتی پالیسیوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح ہم نے اپنے داخلی منصوبوں کی کامیابی کے لیے عالمی شراکت داریوں کو استعمال کیا ہے۔ اس طرح داخلی اور خارجی مقاصد میں بہترین ہم آہنگی ''مودی ڈاکٹرائن'' کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

مودی حکومت سے پہلے منموہن کے دور میں تعلقات میں اس طرح کی گرمجوشی صرف امریکا اور جاپان کے لیے دکھائی جاتی تھی، اب ان ممالک کی فہرست میں متحدہ عرب امارات بھی شامل ہوگیا ہے۔ بھارتی خارجہ سیکریٹری ایس جے شنکر نے مارچ ۲۰۱۵ء میں اپنی ایک تقریر میں خارجہ پالیسی بیان کی۔ انھوں نے جنوب مشرقی ایشیا اور جاپان کے حوالے خارجہ پالیسی پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد کہا کہ اب بھارت اپنے مغربی ممالک کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت نے مغربی ایشیائی ممالک کے حوالے سے اپنی خارجہ پالیسی پر کبھی کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی کبھی اس طرف تزویراتی نظر سے دیکھا۔ حتیٰ کہ ہم توانائی کے حصول کے لیے مغربی ایشیائی ممالک سے رجوع کرتے رہے، وہ بھی کسی پالیسی کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف عالمی منڈی کے نقطہ نظر سے۔ پھر انھوں نے بھارت کی ''تھنک ویسٹ'' پالیسی پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس پالیسی کے تحت دنیا کے مختلف ممالک سے تعلقات قائم کرکے اپنے مفادات کا حصول یقینی بنائیں گے۔

جیسا کہ مودی اپنی تقاریر میں ''لنک ویسٹ'' کے الفاظ کا استعمال کثرت سے کررہے تھے، اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ مغرب میں موجود تمام ممالک سے تعلقات، یعنی اس میں یورپ اور شمالی امریکا بھی شامل ہے۔ ۲۰۱۶ء کے اختتامی دور میں سرکاری بیانات میں ان الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا جانے لگا۔ مئی ۲۰۱۷ء میں وزارت خارجہ کے ترجمان نے اس پالیسی کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے ''گوویسٹ'' کا نام دیا، جس کا مقصد مغربی ایشیائی ممالک سے تعلقات کو فروغ دینا تھا۔

تہران سے تعلقات:

بھارت کی ایران کے ساتھ تزویراتی معاملات میں ہم آہنگی کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ وہ پاکستانی حمایت یافتہ طالبان کی مزاحمت روکنے کے لیے کابل حکومت کا ساتھ دے گا۔ اس باہمی تعاون سے بھارت نے چاہ بہار، ایران سے ہرات، افغانستان تک تجارتی راہداری کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی۔

بھارت اور ایران ایک اور تجارتی راہداری پر بھی باہمی تعاون سے کام کررہے ہیں، جو ایرانی بندرگاہ بندرعباس کو وسطی ایشیا، قفقاز اور روس سے ملائے گی اور بھارت اس منصوبے کو چین کے پورے براعظم پر پھیلے ہوئے ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کا مقابلہ کرنے کے لیے انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ بھارت چاہ بہار کو بھی اس شمال جنوبی راہداری سے ملانا چاہتا ہے۔

بھارت سمجھتا ہے کہ چاہ بہار راہداری کی تعمیر کے ذریعے وہ افغانستان کا پاکستان پر جغرافیائی انحصار کم کرسکتا ہے۔ لیکن اس راہداری پر کنٹینروں کی پہلی نقل وحمل ۲۰۱۴ء میں ۱۲ سال کے عرصے میں ممکن ہوسکی۔ چاہ بہار پر دو اضافی برتھوں کی تعمیر کے ٹھیکے کے لیے ایرانی اور بھارتی تعمیراتی اداروں کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ ذرائع ابلاغ پر تہران اور نئی دہلی اس تاخیر کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے رہتے ہیں۔ بھارتی اور ایرانی حکام نجی ملاقاتوں میں اپنے اپنے ممالک کی بیوروکریسی اور سیاسی مفادات میں تضادات کو اس تاخیر کا سبب قرار دیتے ہیں۔

اور یہ مودی کی خوش قسمتی ہے کہ جب انھوں نے اقتدار سنبھالا تو راہداری تقریباً مکمل ہونے والی تھی۔ مئی ۲۰۱۶ء میں وہ ایران کے دورے پر گئے، جہاں انھوں نے بھارت، ایران اور افغانستان کے درمیان نقل وحمل اور تجارتی راہداری کے معاہدے پر دستخط کیے۔ افغانستان میں امریکا کے فوجی کردار میں کمی، طالبان کے دوبارہ سر اٹھانے کے امکانات اور پاکستان کے ساتھ خراب ہوتے ہوئے تعلقات نے ایران کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس راہداری پر کام تیز کرے۔ ۲۰۱۷ء میں وسطی ایشیا اور روس کی دلچسپی نے شمال جنوب راہداری منصوبے میں بھی پھر سے جان ڈال دی ہے۔ یہ باہمی تعاون ایک طرف، لیکن ایران اور بھارت کے درمیان چند مسائل بھی ہیں۔ مودی حکومت اس بات پر یقین کیے ہوئے تھی کہ تہران سے اقوام متحدہ کی پابندیوں کے خاتمے کے بعد، تہران ''فرضادبی گیس فیلڈ'' کے حصے کی رقم دینے کا اپنا وعدہ پورا کرے گا، لیکن تہران کی جانب سے ٹال مٹول پر بھارت نے جوابی اقدام کے طور پر ایران سے خام تیل کی خرید میں کمی کردی اور یہ جوابی قدم مودی کی رضامندی سے اٹھایا گیا۔

اگرچہ بھارت اور ایران افغانستان میں باہمی تعاون سے کام لے رہے ہیں، لیکن ان دونوں کے تجارتی تعلقات بہت زیادہ مستحکم نہیں ہوسکے۔ بھارت تہران کو تزویراتی طور پر اپنے لیے بہت اہم سمجھتا ہے، لیکن ایران بھارتی راہنماؤں کے داخلی ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے کسی قسم کی مدد فراہم کرنے سے گریز کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے تعلقات تزویراتی طور پر بہتر نہیں ہو پا رہے۔ بھارت توانائی کے متبادل ذرائع کی تلاش اور خلیج فارس سے توانائی کے انحصار میں کمی کے لیے بھی تگ و دو کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایران میں موجود بھارتی شہریوں میں بھی مستقل کمی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مودی حکومت کے نزدیک تہران کی اہمیت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اسی طرح ایران کے نئی دہلی کے حوالے سے اپنے خدشات ہیں۔ بھارتی بینک اور کمپنیاں امریکی پابندیوں کی وجہ سے ابھی بھی ایران سے کاروبار کرنے سے کتراتی ہیں۔ اس کے علاوہ تہران بھارت کے امریکا اور اسرائیل سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی وجہ سے بھی پریشان ہے۔

خلیج کی طرف سفر:

گزشتہ دو سالوں میں خلیج فارس نے نریندر مودی کی خارجہ پالیسی کی ترجیحات میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔ تعلقات کے اس دور میں متحدہ عرب امارات کا مرکزی کردار

ہے۔لیکن بھارت کو ان تعلقات کے معاشی فوائد سمیٹنے کے لیے صبر سے کام لینا ہوگا۔

دونوں حکومتوں کے درمیان ہونے والی سرمایہ کاری کی نگرانی متحدہ عرب امارات کے مرکزی فنڈ ''ابوظہبی انوسٹمنٹ اتھارٹی'' (ADIA) کے سپرد کی گئی ہے۔اور یہ ادارہ بھارت میں سرمایہ کاری کے حوالے سے محتاط رویہ اختیار کیے ہوئے ہے، کیونکہ ماضی میں بھارت میں سیاسی عدم استحکام اور قوانین کی تبدیلیوں کی وجہ سے اس کا سرمایہ کاری کا تجربہ اچھا نہیں رہا۔

مودی حکومت نے غیر ملکی سرمایہ کاری کی بہتر نگرانی اور ان کے اداروں سے بہتر اور موثر روابط کے لیے ''نیشنل انفرااسٹرکچر انوسٹمنٹ فنڈ'' کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کر دیا ہے۔تاکہ غیر ملکی شراکت سے جاری منصوبوں پر بغیر کسی رکاوٹ کے کام کیا جا سکے۔

بھارت خلیجی ممالک میں اپنے فوجی کردار کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہے۔خطے کی بیشتر حکومتیں نہ صرف ایک دوسرے کی مخالف ہیں، بلکہ کسی نہ کسی مقامی گروہ یا فرقے کی حمایت کر کے یمن، عراق اور شام کی خانہ جنگی میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔بھارت کی طرف سے کسی بھی قسم کی فوجی سرگرمی کو کسی خاص ملک کی حمایت کے تناظر میں دیکھا جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ بھارت اس حوالے بہت محتاط رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

اس وقت بھارت کی بنیادی توجہ افغان تنازعہ پر ہے۔وہ براستہ ایران، افغانستان تک تجارتی راہداری بنانے کے لیے کوشاں ہے اور اس کے ساتھ عرب ممالک سے پاکستان کے تعلقات کو کمزور کرنا بھی اہم اہداف میں شامل ہے۔بھارت چاہتا ہے کہ خلیجی ممالک سے پاکستانی حمایت یافتہ دہشت گردوں کی موجودگی ختم کی جائے، تاکہ کسی بھی قسم کی دہشت گردی سے بچا جا سکے۔اس خطے میں بھارت کے فوجی کردار کا انحصار صرف اور صرف اس بات پر ہے کہ پہلے پاکستان کا فوجی اثر ورسوخ کم کیا جائے۔

جہاں تک داعش کا تعلق ہے تو بھارت اس کے اثرات سے بچا ہوا ہے۔ابھی تک درجن بھر کے قریب بھارتی مسلمان ہیں، جنھوں نے داعش میں شمولیت اختیار کی۔ویسے بھی اس خطے میں صرف اسرائیل سے ہی بھارت کے تعلقات ہیں اور وہ تعلقات بھی تزویراتی نہیں ہیں، بلکہ بھارت اسرائیل سے اسلحہ خریدتا ہے اور فوجی تربیت میں اسرائیل اس کی مدد کرتا ہے۔مودی نے، جو اسرائیل کا دورہ کرنے والے بھارت کے پہلے وزیراعظم بن چکے ہیں، اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو ایران اور عرب ممالک سے تعلقات سے یکسر الگ کر کے آگے بڑھایا ہے۔جو کہ ان کی ایک بڑی کامیابی ہے اور خوش قسمتی سے خطے کے حالات نے عرب اسرائیل دشمنی کی شدت کو بھی پہلے سے کہیں کم کر دیا ہے۔

بھارت ان خلیجی ممالک کے ساتھ فوجی مشقوں کا بھی ارادہ رکھتا ہے، جن کے ساتھ اس کے سیکورٹی معاہدے ہیں۔اس طرح کی رپورٹیں بھی آ رہی ہیں کہ بھارت اس خطے میں اپنی مستقل موجودگی کے لیے کوشاں ہے اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے خلیجی ممالک سے تعلقات کس سمت میں آگے بڑھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ چاہ بہار میں بھی اپنی بحریہ کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے تگ و دو کر رہا ہے۔اور اس حکمت عملی پر مودی حکومت میں تیزی سے کام ہوا ہے۔اس کی وجہ خطے میں امریکا کی عدم دلچسپی اور چین کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ بھی ہے۔

جہاں تک بات ہے بھارت اور متحدہ عرب امارات کے مابین معاہدوں کی، جن کے تحت دونوں ممالک مل کر اسلحہ کی پیداوار کریں گے، تو ان معاہدوں پر عملدرآمد شاید اتنا آسان نہ ہو۔کیوں کہ دونوں ممالک بنیادی طور پر اسلحہ کی اسمبلنگ وغیرہ تو کرتے ہیں لیکن جدید اسلحہ خود بنانے کی مہارت نہیں رکھتے۔

نریندر مودی کے تین سالہ دور حکومت میں مغربی ایشیا کے حوالے سے بھارت کی روایتی خارجہ پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی آئی ہے۔آج سے پہلے تک بھارت کے نزدیک خلیجی ممالک کی اہمیت یہ تھی کہ اسے تیل اور گیس کی سپلائی جاری رہے اور قیمتوں میں استحکام رہے۔اور بھارت سمجھتا تھا کہ اس خطے کی سلامتی کی ذمہ داری امریکا کی ہے اور ان سنی عرب ممالک سے پاکستان کے قریبی فوجی تعلقات ہیں۔اس کے علاوہ ان ممالک کو ملکی اشیا برآمد کی جاتی تھیں اور یہ محصولات کا بھی ایک بڑا ذریعہ تھے۔لیکن اب مودی حکومت اپنی گلف پالیسی کو ایک طویل المدت تزویراتی پالیسی کے طور پر دیکھتی ہے۔اگرچہ خلیجی ممالک اب بھی بھارت کی توانائی کی ضروریات پورا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔لیکن اب بھارت تیل اور گیس کے حصول کے لیے دیگر ذرائع پر بھی غور کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بھارت کی داخلی طور پر پالیسی یہ ہے کہ وہ قابل تجدید توانائی کی پیداوار پر بھرپور توجہ دیے ہوئے ہے۔

امریکا کی خطے کے ساتھ کمٹمنٹ کی غیر یقینی صورتحال اور پاکستان کے سیکورٹی فراہم کرنے والے ملک کی حیثیت کھو دینے سے خلیجی ممالک کے لیے بھارت کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔مغربی ایشیا کی تیل اور گیس پر انحصار کرنے والی معیشت جب سے بحران کا شکار ہوئی ہے تو بھارتی لیبر کی مانگ میں بھی خاصی کمی آئی ہے۔اگرچہ بھارتی وزیراعظم ان ممالک میں موجود بھارتیوں کو ملکی ایجنڈے کی تکمیل میں مددگار سمجھتے ہیں، لیکن یہ اب ان کی توجہ کا مرکزی نکتہ نہیں ہے، جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔اس وقت بھارتی حکومت کی زیادہ توجہ اس بات پر ہے کہ اس کے شہریوں سے بہتر سلوک روا رکھا جائے اور ان کو کسی غیر یقینی صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بھارت اس وقت مغربی ایشیا میں سیاسی حکومتوں کے حوالے سے اپنی سوچ پر نظر ثانی کر رہا ہے۔ماضی میں بھارت صدام حسین اور حافظ اسد جیسے حکمرانوں کے ساتھ کام کرنے میں آسانی محسوس کرتا تھا۔اسی طرح ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی میں بھارت نے فلسطین کے قومی مسئلے پر ان کی حمایت کی لیکن وہ اسلام پسند گروہوں سے دور رہی رہا۔

نجی ملاقاتوں میں بھارتی حکام عموماً عراق پر امریکی حملے، عرب بہار اور شام میں اسد حکومت کے خلاف غیر ملکی مداخلت پر تنقید کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے اس طرح کے کاموں سے پر امن ممالک کو نہ صرف دہشت گردی کا گھر بنا دیا گیا ہے بلکہ ان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

لیبیا، شام، عراق کی حکومتوں کے خاتمے اور کمزور ہونے کی وجہ سے بھارت نے خلیجی ممالک اور مصر سے تعلقات بڑھائے ہیں۔لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ زیادہ تر موقعوں پر ان ممالک کی طرف سے پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔اس کا ثبوت ۲۰۰۶ء میں سعودی بادشاہ عبداللہ بن عبدالعزیز کا دورہ بھارت ہے۔خلیجی ممالک کی اہمیت اب بھارت کی نظر میں بھی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ اب ان ممالک کو مستقبل کے معاشی اور تزویراتی شراکت دار کے طور پر دیکھتا ہے۔بھارت نے مصر کی سیسی حکومت کو کافی امداد دی، جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔لیکن عرب کے امراء اور شیوخ پر بھارت نے اس سے کہیں زیادہ مہربانیاں کی ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مودی نے خارجہ تعلقات کے بارے میں بڑی واضح حکمت عملی اپنائی، اس حکمت عملی کے تحت اس ملک کی طرف زیادہ توجہ دی گئی جو بھارتی منصوبوں کو مکمل کرنے میں زیادہ معاون ثابت ہو۔ان سب معاملات میں بھارت کو ایک اور فائدہ یہ بھی رہا کہ بھارتی مسلمانوں نے کبھی بھی انتہا پسندی کی طرف اپنے قدم نہیں بڑھائے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۲

دہشت گردی کے خلاف اگلا مرحلہ

Liza Monaco

دو ہفتے قبل نیو یارک سٹی پر نائن الیون کے بعد سب سے بڑا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ مین ہیٹن کی ویسٹ سائڈ ہائی وے کو مقتل بنایا گیا۔ یہ حملہ ظاہر کرتا ہے کہ دہشت گرد حملے انتہائی پیچیدہ شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ہم نے نائن الیون کے بعد ایسے حملوں کی روک تھام کے لیے انفرااسٹرکچر تعمیر کیا لیکن ہم دہشت گردی کے اس نئے مرحلے سے نمٹنے کی تیاری نہیں رکھتے۔ ہاں، تازہ حملے کے بعد آنے والی اچھی خبر یہ ہے کہ اس کے بعد مختلف قومیتوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ بری خبر یہ ہے کہ جس دوران ہم دہشت گردی کے تدارک کے لیے کرمنل جسٹس کو تیز کرنے کی بات کر رہے تھے، ہم نے واپسی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اپنے نظام انصاف پر تنقید شروع کر دی۔

ہمیں اپنی سرزمین پر ہونے والے حملے پر کس طرح کا ردعمل دینے کی ضرورت ہے؟ تارکین وطن کے خلاف نفرت بھڑکانے اور سیاسی حملے کرنے کی یا پھر اپنے نظام انصاف جسٹس پر تنقید کے بجائے قابل عمل امکانات کی دیکھنے کی؟ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے۔ محض بیان بازی سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دنیا میں صرف روس ہی ایسا ملک نہیں جو امریکا کو کمزور دیکھنا چاہتا ہے۔ دہشت گردوں کا بھی یہی ایجنڈا ہے۔ ہمیں کسی کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

جب دہشت گردی ہوتی ہے یا کوئی اور سانحہ گزرتا ہے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ ہمیں تیز اور موثر نظام انصاف کی ضرورت ہے۔ حملے کے بعد صدر ٹرمپ مشتبہ شخص کو گوانتانا موبے بھیجنے پر تل گئے تھے لیکن شکر ہے کہ معقولیت کی بات سن لی گئی۔ درحقیقت اس مرحلے پر ہمارے سامنے بحث جنگ اور قانون کی حکمرانی کی ہے۔ گزشتہ انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین نے صدق دل سے کام کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ملک کو دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے تمام دستیاب وسائل (مثلاً عسکری قوت، انٹیلی جنس، نفاذِ قانون، سفارت کاری اور معاشی پابندیاں) بروئے کار لاتے ہوئے دہشت گردوں کا نیٹ ورک ختم کرنا ہوگا۔ امریکی سرزمین سے گرفتار ہونے والے دہشت گردوں کو امریکا کے اس نظام انصاف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جسے دنیا رشک کی نظر سے دیکھتی ہے اور جو قانون کی حکمرانی یقینی بنانے والے معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے بہت حد تک مطلوب نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

ہمارے سامنے اس نظامِ انصاف کا ریکارڈ واضح ہے۔ انٹیلی جنس حاصل کرنے، ریکارڈ کو محفوظ بنانے، نتیجہ نکالنے اور دہشت گردوں کے بچ نکلنے کے امکانات ختم کرنے کے لیے اس نظام کے پاس بہت سے وسائل ہیں۔ اس نظام میں دس لاکھ سے زائد وفاقی، ریاستی اور مقامی افسران و اہلکار مستعد و فعال رہتے ہیں۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری جان اور ریاست کے اثاثوں کو محفوظ بناتے ہیں۔ لیکن کیا ان کی خدمات کے صلے میں انہیں تمسخر کا نشانہ بنانا اور کسی بھی غلطی کی بنیاد پر شدید نکتہ چینی کرنا درست ہے؟ صرف یہی نہیں، اس نظام میں تیس ہزار سے زائد ایف بی آئی ایجنٹ، انٹیلی جنس تجزیہ کار اور دیگر پروفیشنلز ہیں جنہیں میں بہت فخر سے اپنے کولیگز کہا کرتا تھا۔ اس قوم کی خدمت روزانہ اپنے کام سے لگاؤ رکھنے والے وفاقی قانون دان بھی کرتے ہیں اور یہ بات کسی بھی مرحلے میں کوئی مذاق نہیں۔ اس میں نیو یارک کے جنوبی علاقے سے تعلق رکھنے والے بھی شامل ہیں جو اپنی آزادی اور روایات سے محبت کرتے ہیں اور نیو یارک پر حملے کے وقت مشتبہ شخص کو پکڑنے کے لیے تیزی سے روانہ ہوئے تھے۔ ان دہشت گردوں اور جاسوسوں کے خلاف انٹیلی جنس کی بنیاد پر کارروائیوں کی اشد ضرورت کے نتیجے میں محکمہ انصاف کی نیشنل سیکیورٹی ڈویژن کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جس کی قیادت بارک اوباما کے دور میں میرے سپرد تھی۔ نائن الیون کے بعد ہمارے یہ اقدامات دہشت گردی کے سیکڑوں مقدمات میں انصاف کی راہ ہموار کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔

کسی بھی مشتبہ شخص کو گوانتانا موبے بھیجنے کی حکمت عملی محض اس بنیاد پر درست نہیں کہ ہم جنگ کی صورت حال سے دوچار ہیں اور دشمنوں کو وکیل نہیں ملنے چاہییں۔ سپریم کورٹ نے طے کر دیا ہے کہ گوانتانا موبے وکلا سے خالی علاقہ نہیں۔ پندرہ سال کے دوران ملٹری کمیشنز نے صرف آٹھ مرتبہ مجرموں کو سزا سنائی اور ان میں سے بھی بیشتر سزاؤں پر عمل نہیں کیا جا سکا۔ نائن الیون اور یو ایس ایس کول پر بمباری کے متاثرین اور ان کے اہل خانہ آج بھی انصاف کی راہ تک رہے ہیں۔

ملزم کو گوانتانا موبے بھیج دینے سے انصاف نہیں ہوگا۔ نہ ہی اس سے انٹیلی جنس کے مقاصد پورے ہوں گے اور یہ سمجھ آئے گی کہ ہیلوئین کی شام کو راہ گیروں پر ٹرک چڑھانے کوئی کیسے آ گیا؟ ملزم نے ایف بی آئی کے ارکان سے بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ اس کا یہ حملہ داعش کے پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ وہ کیسے اور کب اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوا۔ مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔

یہ سوچ خطرناک ہے کہ ایف بی آئی اس معاملے میں زیر حراست شخص سے کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔ نائن لیون کے بعد اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایف بی آئی دہشت گردوں سے فوری پوچھ گچھ کر کے نئے خطرات اور ممکنہ حملوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کی حاصل کی ہوئی معلومات مزید دہشت گردوں کو گرفتار کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ہمیں اس وقت ایف بی آئی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے پاس یہ نادر موقع ہے کہ ملزم ہمارے پاس زندہ حالت میں موجود ہے۔ نیو یارک سٹی پولیس کے ڈپٹی کمشنر جان ملر کا کہنا ہے کہ ملزم داعش کے ہاتھوں کا کھلونا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک گاڑی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ دہشت گردوں کی اس نسل نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے نئے چیلنج کھڑے کیے ہیں۔ اس واقعے سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔

اس چیلنج کے جواب میں ۲۰۱۰ء میں اس شخص کی امریکا آمد کا سبب بنے والے ڈائیورسٹی امیگرنٹ ویزا پروگرام پر ذمہ داری ڈالنا نہایت غلط بات ہے۔ اطلاعات کے مطابق وہ امریکا آنے کے کئی سال بعد داعش کے نظریے سے متاثر ہوا۔

ہمیں ہر اس شخص کے لیے جو اس ملک کے حقوق اور فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے، پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ نظر ثانی کسی خاص پروگرام کی بجائے انٹیلی جنس کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ ۲۰۱۵ء میں پیرس حملوں کے بعد ڈی ایچ ایس نے ویزا ویور پروگرام کو مضبوط کیا۔ ہمیں سوشل میڈیا کمپنیوں کے ساتھ مل کر بھی کام کرنا چاہیے تاکہ ان کا غلط استعمال روکا جا سکے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"The next phase in the War on terror is here".
("Foreign Policy". November 8, 2017)

نئی شاہراہِ ریشم: چین کے عزائم

Charlie Campbell

نئی شاہراہِ ریشم کے چاروں طرف تعمیرات چین کی قیادت کے اہم منصوبوں میں شامل ہیں۔ چین کے وہ دور دراز کے مغربی علاقے جو قازقستان کے ساتھ ملتے ہیں، یہاں کے گنبد نما گھر اور اونٹوں سے ملتی جُلتی رہائشیں موجود ہیں۔ مگر یہاں سے جو صورتحال سامنے آرہی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہاں پر ایک نیا شہر تعمیر ہونے جارہا ہے۔ چار سال پہلے دریافت ہونے والا یہ شہر قورغاس (Khorgos) اپنے اندر دنیا کے لیے بے پناہ کشش لیے ہے۔ اس کشش کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں دنیا کا مصروف ترین inland port کا منصوبہ زیرِ غور ہے، جو چین کو دوبارہ شاہراہِ ریشم تعمیر کرنے پر اکسا رہا ہے۔

یہاں مزید ایسے تجارتی علاقے (free trade zones) بنائے جارہے ہیں، جو ہر روز تیس ہزار کاروباری افراد کے لیے آمد و رفت کو ممکن بنائیں گے۔ یہاں مصنوعات کی تیاری کے لیے بہت بڑے اور جدید کارخانے تعمیر کیے جارہے ہیں، جن میں مصنوعات تیار کرنے والوں کو چینی حکومت کی طرف سے خصوصی طور پر دو سال تک کرایہ نہ دینے کی سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ اس وقت رقم جمع کروانے والوں نے مرکزی گزرگاہ پر ٹرکوں کی قطاریں کھڑی کردی ہیں، جو زرعی آلات اور blue industrial piping (ایسے پائپ جو وسیع پیمانے پر ذرائع آمد و رفت میں استعمال ہوتے ہیں) کے حامل ہیں۔ ان ٹرکوں کے ڈرائیور نیند کی کمی کا شکار ہیں اور اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے پوری دنیا کے سفر کی جانب اشارہ ملنے کے منتظر ہیں۔ آج کل قورغاس کی فضا گدلی اور مٹی سے اَٹی ہوئی ہے۔ یہ خیالات گوجیان بِن (Guo Jianbin) کے ہیں جو Khorgos Economic development zone administration committee کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا مزید یہ کہنا بھی ہے کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا کہ جگہ مالی وسائل سے لبریز ہوگی۔

ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کی وجہ سے چین کے وزیر اعظم نے قورغاس شہر کو انتہائی اہم قرار دیا ہے۔ یہ ماضی کی قدیم شاہراہ ریشم کو ہائی ویز، بندرگاہوں، ریلویز کے ساتھ دوبارہ ملانے کا وہ منصوبہ ہے، جو ایشیا کو مشرقِ وسطیٰ کی جانب سے مغرب اور شمال سے افریقا سے ملا دے گا۔ قورغاس کا یہ راستہ بڑے پیمانے پر کارگو کی نقل و حمل کو یورپ اور ایشیا تک ممکن بنا سکتا ہے۔

یہاں ایک ایسا راستہ بنایا جارہا ہے، جو سمندر کے ساتھ ساتھ چین کے کئی شہروں سے زمینی رابطے پیدا کردے گا۔ افریقا اور ہر اس ملک کی بندرگاہ کے ساتھ رابطے کو ممکن بنا سکے گا، جو سمندروں کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ چین کے ڈویلپمنٹ بنک کے مطابق ۹۰۰/ارب امریکی ڈالر کی خطیر رقم سے تقریباً ۹۰ منصوبے مکمل کیے جائیں گے۔ کینیا میں ۴۸۰ ملین امریکی ڈالروں سے سمندر کے درمیان ایک بندرگاہ بنائی جائے گی، جو بعد میں سڑکوں، ریلویز اور پائپ لائنز کے ذریعے جنوبی سوڈان کو ایتھوپیا سے ملائے گی اور وہاں سے کیمرون کی بندرگاہ ڈوالا تک پہنچ جائے گی۔ ۳ء۷/ارب ڈالر کی لاگت سے ترکمانستان سے چین تک ایک نئی پائپ لائن بچھائی جارہی ہے۔ یہ ہر سال چین کو ۱۵/ارب کیوبک میٹر گیس فراہم کرے گی۔ چنگیز خان کے بعد سے اب تک بین الاقوامی سطح پر اپنی عالمی خواہشات کو اتنے بڑے پیمانے پر چین نے کبھی آگے نہیں بڑھایا۔ مگر اس بار پرانی سڑی ہڈیوں اور راکھ پر زندگی گزارنے کے بجائے اس چین کی نگاہ بندرگاہوں، شاہراہوں اور تیز ترین ریلویز پر ہے۔ ''ایک دوسرے سے تبادلے اجنبیت کو ختم کرتے ہیں، ساتھ مل کر سیکھنے سے نفرتیں ختم ہو جاتی ہیں اور بقائے باہمی کا تصور برتری جیسے منفی خیال کو ختم کرنے کا باعث بن جاتا ہے''۔ یہ الفاظ چینی صدر نے مئی میں ہونے والے ون بیلٹ ون روڈ فورم کے موقعے پر جاری اعلامیے میں کہی۔

یہ وہ اولین مقصد ہے جو چینی قیادت کو ایسے وقت میں عالم گیریت کو سہارا دینے میں مدد کر رہا ہے، جبکہ امریکا اپنے بین الاقوامی معاہدوں پر ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے دنیا کے ۶۵ ممالک میں قیام پذیر دنیا کی ۷۰ فی صد آبادی تک اپنی مصنوعات پہنچانے میں کامیابی حاصل ہوگی۔ آبادی کے اس حجم کی ایک چوتھائی آبادی کو توانائی کی فراہمی کے عوض اور ایک چوتھائی کو مصنوعات پہنچانے پر خدمات کے عوض جو منافع حاصل ہوگا، وہ دنیا کے کل منافع کا ۲۸ فی صد یعنی لگ بھگ ۲۱ کھرب امریکی ڈالر ہے۔ بیجنگ اس معاملے میں پُر یقین ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی حدود میں بڑے پیمانے پر ایسی اقوام موجود ہیں جو بے پناہ وسائل رکھتی ہیں۔ لیکن بنیادی انفراسٹرکچر سے محروم ہیں اور چین اپنے وسائل کے ذریعے ان مسائل کو حل کرسکتا ہے۔

دیگر ممالک سے زمینی رابطہ ممکن ہونے کی صورت میں چین اپنی مصنوعات کے لیے نئی منڈیاں پیدا کرے گا اور ان روابط سے خوب فائدہ اٹھائے گا۔ چین کے وزیر تجارت زہونگ شان مارچ میں ہی یہ اعلان کر چکے تھے کہ چین کی کمپنیوں نے پہلے ہی ایک لاکھ ۸۰ ہزار نوکریاں پیدا کرلی ہیں۔ ون بیلٹ اینڈ روڈ کی مد میں ۱ء۱/ارب امریکی ڈالر ٹیکس ریونیو کی شکل میں ادا بھی کیا جاچکا ہے۔ ہزاروں چینی انجینئر، کرین آپریٹر اور سٹیل کو پگھلانے والے اس عظیم منصوبے سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ پروفیسر نک بسلے، جو ایک آسٹریلوی جامعہ میں ایشیائی تجارت کے ماہر ہیں، کا کہنا ہے کہ دنیا کے اس سب سے اہم حصے میں معاشی حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے چین کی ہر صورت ضرورت ہوگی۔

چین آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے اور معاشی طور پر امریکا کے بعد دوسرے درجے پر ہے۔ چین کے صدر کے مطابق یہ قدم بالکل درست ہے۔ چین کی کچھ عرصے پہلے کی تاریخ افراتفری، جنگ و جدل، خود کو مصیبت میں ڈالنے، معاشی تباہی اور غربت سے پُر ہے۔ مگر آج صورتحال یہ ہے کہ چینی کمپنیاں یورپ کی کئی فٹبال ٹیموں کو خرید چکی ہیں، ہالی ووڈ میں فلم اسٹوڈیو کی مالک ہیں اور نیویارک سٹی کے والڈروف آسٹریا ہوٹل ان کی ملکیت میں ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ سولر پینل، ہوا سے چلنے والی ٹربائن، اور تیز ترین ریلویز چین کے پاس ہیں۔ جنوری میں زی نے چین کے پہلے صدر کی حیثیت سے ورلڈ اکنامک فورم سے خطاب کیا تو انھوں نے ایک مدبر، سمجھدار اور بین الاقوامی شخصیت کے طور پر خود کو اس طرح پیش کیا کہ آنے والے وقت میں وہ دنیا کے لیے قوانین اور معیار ترتیب دینے والے ہیں اور دنیا ان پر عمل پیرا ہوگی۔

۱۸/اکتوبر ۲۰۱۷ء کو چینی کمیونسٹ پارٹی کی انیسویں مجلس میں ان کے الفاظ پڑھنے کے قابل ہیں۔ انھوں نے کہا؛ ''اب یہ وقت ہے، جب ہم اس دنیا کے سٹیج کی سب سے اہم جگہ پر خود کھڑے ہوں''۔

یہ دوررس نگاہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے لیے بالکل بھی خوشگوار نہیں رہی، جو اپنے ملک کی شاہراہوں، پُلوں اور توانائی کے منصوبوں کے لیے ابھی تک ایک کھرب کے بل پاس نہیں

کر سکے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدھے سے زیادہ امریکی جانتے ہیں کہ ان کی بنیادی ضرورت کیا ہے۔ ٹرمپ کی Trans Pacific Partnership trade agreement میں بے جا مداخلت نے امریکا کو کمزور کر دیا ہے۔ بحرالکاہل کی ایک طاقت ہونے کے ناطے اور امریکا کے پیرس معاہدے سے نکل جانے کے بعد اب دنیا چین کو عالمی سربراہ کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔

شاہراہِ ریشم کا وہی جاہ جلال بحال کرنے میں ہزار ہا مشکلات درپیش ہیں۔ ان میں سب سے اہم سوال دنیا کی ایسی قوموں کی معیشت میں اربوں ڈالر لگا دینا ہے، جو ایک طرف غریب ترین ہیں، تو ساتھ ساتھ معاشی طور پر انتہائی غیر مستحکم بھی۔ جہاں ایک طرف مصنوعات کی گرتی قیمتوں نے کچھ منصوبوں کے بارے میں اندازے غلط ثابت کیے ہیں تو دوسری طرف کچھ منصوبے سیاسی ہوا کا رُخ میزبان ملکوں کی جانب موڑ رہے ہیں۔ یہ مستقبل میں پیدا ہونے والی مشکل قورغاس والوں کو صاف دکھائی دے رہی ہے۔ ایک ٹرین چک (جو آہستہ مگر طویل سفر کے لیے ہوتی ہے) ۷۰۰۰ میل کا سفر کرے گی۔ جس میں وہ مصنوعات بنانے والی ۲۷ کمپنیوں کے مراکز سے گزر کر مغرب کے ۱۱ ملکوں تک پہنچے گی۔ یہ دنیا کی سب سے لمبی راہداری ہوگی، جس کا زیادہ تر سفر پرانی شاہراہِ ریشم پر ہوگا۔ جس پر تجارتی قافلے ہاتھی دانت، پستے، اور کھجوریں لے کر مغرب کی منڈیوں تک جا رہے ہوں گے۔ Guo کہتا ہے کہ پچھلے سال ۲۰۵۰ کارگو ٹرینیں قورغاس سے گزری ہیں۔ اور اسے پورا یقین ہے کہ اس سال ۲۰۱۷ء میں یہ تعداد ۵۰۰۰ تک ضرور جائے گی۔

قورغاس Tak-lamakan صحرا کے کنارے واقع ہے۔ یہ اس قدر نامہربان زمین ہے کہ اسے موت کے علاقے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ابھی تک دنیا کا سب سے دور دراز علاقہ ہے۔ Khorgos یوریشیا پول (یورپ اور ایشیا) سے محض ۱۰۰ رمیل کے فاصلے پر ہے، جو دنیا کے کسی بھی سمندر سے دور ترین جگہ ہے۔ جہاں تک رسائی کبھی آسان نہیں رہی۔

آج Taklamakan کے مغرب میں چینی شہر Xinjiang کا ایسا علاقہ ہے جو اپنے سیاسی معاملات خود دیکھتا ہے۔ جس کی سرحد سات وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کی ریاستوں سے ملتی ہے۔ اس لحاظ سے زمینی حصے پر یہ بیلٹ اینڈ روڈ کا مرکز ہے۔ قدیم شاہراہِ ریشم کا ۳۵۰۰ میل کا سلسلہ اس الاسکا جتنے رقبے کے علاقے سے گزرتا ہے۔ جہاں Taklamakan کے جنوب پر خشک اور بنجر ٹیلے شمالی علاقے کے سرسبز اور وسیع گھاس کے میدانوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔

مگر Xinjiang بھی چین کا ایک انتہائی غیر مستحکم علاقہ ہے۔ یہ علاقہ Uighur ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے، جہاں مسلمانوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان پر نسلی بنیادوں پر مقدمات چلائے جاتے ہیں، اس لیے اکثر ہنگامہ آرائی کا شکار رہتا ہے۔ سرکاری اعداد کے مطابق ۲۰۰۹ء میں صوبائی دارالحکومت Urumqi میں فسادات پھوٹ پڑے، جس کے نتیجے میں ۱۹۷ رلوگ ہلاک ہوئے۔ یہاں امن وامان کی صورتِ حال انتہائی مخدوش ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ تک لینے کے لیے ایکسرے اور کھوج لگانے والے آلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہر کے مرکزی بازاروں میں پولیس اپنی رائفلوں پر سنگینیں لگائے اپنی مسلح کاروں کے قریب کھڑے لوگوں پر ایسے حملہ کرنے کو تیار رہتے ہیں جیسے کوئی زندہ بھیڑ کسی قصائی کی دکان پر اپنا آخری وقت دیکھ رہی ہو۔ یہ چین کا واحد صوبہ ہے جو ۴ جی موبائل کی سہولت نہیں رکھتا، کیونکہ سرکار کے مطابق اگر ان کو یہ سہولت دستیاب ہوئی تو ممکن ہے یہ لوگ جہادی مواد ڈاؤن لوڈ کرنا شروع کر دیں۔ ایک طرف تو بیلٹ اینڈ روڈ کے شوپیس قورغاس میں حکومت استحکام کو بنیادی اہمیت دیتی ہے اور یہاں کاروباری شخصیتوں کو بہترین ماحول مل رہا ہے، لیکن دوسری طرف جنوب کے پرآشوب علاقوں میں اویغور (Uighurs) کو کسی قریبی گاؤں تک میں جانے کے لیے سرکاری اجازت نامہ درکار ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ ترقی قابلِ قبول نہیں۔ ایک Uighurs ٹیکسی ڈرائیور (جس کا نام بتانا ممکن نہیں) کا کہنا تھا کہ پہلے حالات زیادہ اچھے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ سردیوں میں وہ wild turkey (ایک جنگلی جانور) کا شکار کرتا تھا گرمیوں میں بیر چنتا تھا۔ ہمیں یہ سب (بے جا سیکورٹی اقدامات) نہیں چاہیے۔ جبکہ دوسری جانب امن وامان کا مسئلہ بھی کوئی چھوٹا نہیں۔ میانمار میں پائپ لائن اور ڈیم، مغربی افریقا میں بندرگاہیں، پن بجلی منصوبے اور تانبے کی کانیں افغانستان میں، یہ سب ہنگامہ آرائی کے لیے تاوان کے طور پر ضبط کی جا سکتی ہیں۔ پچھلے سال کینیا میں مقامی آبادی کی طرف سے ریلوے ملازمین پر حملہ کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نوکریوں کے معاملے میں مقامی آبادی کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ رکھا گیا۔ ممکن ہے چین کو اپنی فوجی نفری مجبوراً ان علاقوں میں بڑھانی پڑے جو شورش زدہ ہوں۔ جس سے بین الاقوامی سطح پر امن وامان کے لیے کی جانے والی کوششوں کا مرکز افریقا منتقل ہو جائے گا۔ اگست میں چین نے اپنی پہلی سمندر پار فوجی چھاؤنی کا افتتاح جبوتی میں کیا ہے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ چین کی طرف سے اقوام متحدہ کو امن قائم رکھنے کے لیے مہیا کیے جانے والے دستے باقی چار مستقل ارکان سے زیادہ ہیں۔ Institute of International Affairs at Nanjing University کے ڈین زین فینگ کے مطابق بیلٹ اینڈ روڈ کے لیے سب سے گھمبیر مسئلہ امن و امان کا ہی ہے۔

معاشی صورتحال کو دیکھا جائے تو یہ سوال بہت سے پہلو سامنے لاتا ہے۔ اتنے بڑے منصوبے کی ابتدا کیسے کی جا سکتی ہے؟

قورغاس سے مغربی ممالک تک مصنوعات بذریعہ مال بردار ٹرین پہنچانے پر اخراجات سمندری راستے سے تین گنا زیادہ ہیں۔ جس میں دگنی کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں تحلیل ہوگی، جب کہ اس میں وقت کی بچت ضرور ہو رہی ہے۔ چینی فیکٹریوں سے مغربی ممالک تک جو سفر سمندری راستے سے ۳۵ دن کا تھا وہ اب ۱۸ ردن کا ہوگا۔ کچھ مصنوعات مہنگے کرائے کے باوجود کم وقت میں پہنچنے پر فائدے میں رہیں گی۔ کھانے پینے کی اشیا اور ادویات تو ہوائی جہاز کے ذریعے جاتی ہیں، کیوں کہ ان کے خراب ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ الیکٹرانکس اور گھریلو استعمال کی چیزوں کو بھیجنے کے لیے سستے ترین وسائل دیکھے جاتے ہیں تاکہ منافع کی شرح زیادہ رہے۔

مجموعی معاملات میں چین کپڑے، الیکٹرانکس اور تعمیرات کا سامان قورغاس سے مغربی ممالک کو بھیج رہا ہے، مگر Guo کہتا ہے کہ یہ سامان لے کر جانے والا واپسی پر بالکل خالی ہاتھ آ رہا ہے۔ مغرب کی طرف یہ سفر اخراجات کے حوالے سے کسی طور بھی مناسب نہیں، ادھر وسط ایشیائی ریاستوں کی معیشت اتنی مضبوط نہیں۔ قورغاس کے فری ٹریڈ زون میں قازقستان سے محض دس فیصد کے قریب کاروباری لوگ آ رہے ہیں۔ جبکہ چینی (mink furs) کپڑے کی ایک قسم) جارجیا کی سرخ شراب اور سائبیریا کا شہد زیادہ خریدتے ہیں۔ قازقستانی rust-bucket (ایک قسم کی مشینی گیم) چھوٹی بسوں کی clutch-ing plastic chairs، سستے بستر، اور counterfeit sneakers (دھوکا اور فراڈ کرنے میں استعمال ہونے والے آلات) کی خریداری کے لیے قطار در قطار آ رہے ہوتے ہیں۔ (فری ٹریڈ زون) کی ایک دکان کے ایک منیجر کا کہنا تھا

کہ ہمارے پاس نوے فیصد گاہک چینی ہیں۔

چینی صدر کی بیلٹ اینڈ روڈ کو ذاتی سرپرستی میں لیے جانے پر بہت سے ایسے منصوبے بھی تکمیل کی طرف گامزن ہیں جن پر بہت سے سوالات موجود تھے۔ مثال کے طور پر ایک ٹرین کی پٹڑی جو لاؤس (ایک ملک جو چاروں طرف سے زمین سے گھرا ہوا ہے) کے ذریعے بچھائی جارہی ہے، ۷/ارب امریکی ڈالر سے تیار ہوگی، جو کہ چین کی آدھی آبادی کے GDP کے برابر ہے۔ اس منصوبے کو ۷۰ فیصد سرمایا کاری چین دے رہا ہے۔ جب کہ باقی ۳۰ فیصد لاؤس کی حکومت ادا کررہی ہے۔ وہ بھی ایک طرح سے چین ہی ادا کررہا ہے (چینی اسٹیٹ بنک کی ایک کنسورشیم کی طرف سے قرضے کی صورت میں)۔

ایرمیکا ڈاونز جو کہ CNA میں ایک ماہرِ معاشیات ہیں اور جنہوں نے چار سال اس بیلٹ اینڈ روڈ پر تحقیق کی، ان کا کہنا ہے کہ چینی حکومت کی طرف سے معاشی امداد کے باوجود اپنا سارا مال ومتاع اس منصوبے میں جھونک دینا ایک کمزور قدم ہے۔

چوکس اور ہوشیار بینکر اس منصوبے کو ''ون بیلٹ ون ٹریپ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲۰۱۳ء میں جب چینی صدر نے اس منصوبے کا اعلان الماتے میں کیا، تب قیمتیں اپنے وقت کی انتہائی سطح پر تھیں۔ مگر یہ عمودی رفتار سے نیچے آئی ہیں۔ مگر چین اس بات کا اہل ہے کہ خسارے کے سودوں کو منافع میں تبدیل کرسکے۔

اس کی پچھلی تین دہائیوں سے سامنے آنے والی معاشی اٹھان اس بات کا ثبوت ہے کہ چینی حکومت سرمایہ داری میں ہر لحاظ سے آگے ہے۔ اس کے پاس وسائل ہیں۔ اس کا GDP (خالص قومی پیداوار) پچھلے سال ۲ء۱۱/کھرب امریکی ڈالر تھا، جو کہ قدرے بہتر تھا اور پھر بہت آہستہ سے مگر بتدریج بڑھتا گیا۔ جس میں اگست تک کا ۵ء۴۸/ارب کا بچا ہوا trade surplus بھی شامل ہے۔ مشترکہ سرمایہ جو بیلٹ اینڈ روڈ کے لیے مختص کیا گیا اس میں Silk Road Fund, Asian Infrastructure Investment Bank (AIIB), New Development Bank, China Development Bank, Export- Import Bank of China and the nation's humanitarian aid budget کے تعاون سے ۲۶۹/ارب امریکی ڈالر شامل کیے گئے۔ باقی یعنی ۹۰۰/ارب ڈالر نجی چینی بینکوں اور میزبان ممالک کی طرف سے شامل کیے گئے۔ بیجنگ کے پاس اتنی مرکزی قوت ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ پر سفر کرنے والے تاجروں کو ہزار ہا ترغیبات اور تحریکیں دے کر جس کام کو کرنے کا تہیہ کرلیا اسے تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود خطرات موجود ہیں۔

ایک چینی ماہر کا کہنا ہے کہ چینی یہ تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ اس تیزی سے بدلتی صورتحال میں بھی اپنے لیے سرمایہ پیدا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ آخر میں نتیجے کے طور پر بینک بہت سے منصوبے منافع نہ دے سکیں۔ لیکن یہ انفرااسٹرکچر ابتدا سے ہی مثبت پہلو لیے ہوئے ہے، اس بات سے قطع نظر کہ سرمایہ دار اپنا سرمایہ کم کرلیں، یا واپس لے لیں، سڑکیں، پُل، سرنگیں لوگوں کو آپس میں ملانے اور تجارت کو بڑھانے میں مدد دیں گی۔ The Asian Development Bank کے مطابق ایشیا کو اپنی بنیاد (infrastructure) کھڑی کرنے کے لیے ۲۰۳۰ء تک ۲۶ ٹریلین ڈالر یا تقریباً ۷ء۱/ارب ہر سال درکار ہیں۔

کئی ایسے ممالک جو اس بیلٹ اینڈ روڈ کے کنارے پر واقع ہیں، وہاں تھوڑا سا لگایا گیا سرمایہ بھی ان لوگوں کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لاسکتا ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بجز، نئی شاہراہ ریشم جغرافیائی سیاست کی ایک ابتدائی چال ہے۔ Hambantota بندرگاہ جو سری لنکا کے جنوب میں ۲۰۱۰ء میں تعمیر کی گئی اور جس کا سارا سرمایہ چین نے فراہم کیا، پہلے دن سے کام شروع کرچکی ہے۔ اس سال جولائی میں سری لنکن حکومت نے اس کے ۷۰ فیصد حصص چین کی ایک کمپنی، جو سری لنکا کی جانب سے اس کو چلا رہی تھی، کو ۱/ارب ڈالر میں فروخت کردیے تھے۔ مگر بھارت اس معاملے پر تشویش میں مبتلا ہے۔ اس کے خیال میں یہ بندرگاہ کسی جنگی مقصد کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔ دوسری جانب سی پیک بھی پاکستان اور چین کو ایک دوسرے کے قریب کررہا ہے۔ جس سے چینی صوبے Xinjiang تک انتہا پسندوں کی رسائی مزید مشکل ہوگی۔ Asian Infrastructure Investment Bank جس کا ہیڈکوارٹر بیجنگ میں ہے، ۲۰۱۶ء میں بیلٹ اینڈ روڈ کو سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے بنایا گیا تھا، مگر اس کا ایک اور مقصد بھی تھا کہ دنیا کو دکھا دیا جائے کہ چین واقعی کسی multilateral development bank کو بین الاقوامی معیار کے مطابق چلا بھی سکتا ہے۔ آنے والے وقت میں جب دنیا کو دیے جانے والے احکامات کے مرکز بدل رہے ہیں، اور امریکا کی اس مہم جس میں وہ اقوام کو اس منصوبے کا حصہ بننے سے روک رہا ہے، کچھ کے شامل نہ ہونے کے باوجود اس کے اپنے قریب ترین حواری یعنی آسٹریلیا اور برطانیہ بھی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ چین نے جس وقت یہ خیال دنیا کے سامنے پیش کیا، اس وقت کچھ غیر تسلی بخش پہلو موجود تھے۔ مگر AIIB کے صدر Jin Liqun نے TIME کو اپنے بیجنگ کے دفتر میں بتایا کہ غیر تسلی بخش پہلو تسلی بخش کیے جاسکتے ہیں۔ اور یہ وقت ہے کہ لوگوں کو اس تصور کی تعریف کرنی چاہیے۔

امریکا ابھی تک اس حقیقت کو جھٹلا رہا ہے کہ یہ بیلٹ اینڈ روڈ کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ جون میں اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے یہ تبصرہ کیا کہ چین کے باقی علاقوں کی نسبت اس آزاد تجارتی علاقے (فری ٹریڈ زون) میں تھوڑی سی آزادی زیادہ ہوگی۔ اس سے زیادہ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اور امریکا نے ایک کمتر درجے کا وفد بھی مئی میں ہونے والے ایک فورم میں بھیجا، جو بیجنگ میں منعقد ہوا۔ اس سے اگلے ماہ جون میں چینی میڈیا نے یہ خبر دی کہ امریکی صدر ٹرمپ نے بیجنگ کے ایک اعلیٰ افسر سے کہا کہ وہ اس پراجیکٹ میں تعاون کرنے کو تیار ہے مگر وہائٹ ہاؤس نے ایسی کسی بھی خبر کی تردید کی ہے۔

اس کے بعد ۳/اکتوبر کو امریکا کے سیکرٹری دفاع Jim Mattis نے سی پیک پر بھارت کا رٹا رٹایا یہ اعتراض لگایا کہ اس کے روٹ متنازعہ کشمیر سے گزر رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جو عالمگیریت کے تحت ایک دوسرے سے قریب آرہی ہے اور جہاں کئی بیلٹ اینڈ روڈ موجود ہوں، ایسے میں کسی ایک قوم کی طرف سے کسی ون بیلٹ ون روڈ کے روکنے کا حکم دینا قطعی طور پر ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی شاہراہِ ریشم چین کے خطے میں بڑھتے ہوئے سیاسی اثر رسوخ کی ایک تازہ مثال ہے۔ جبکہ دوسری جانب بے مقصد لڑائیوں، اور شخصیات سے مڈبھیڑ نے امریکی خارجہ پالیسی کو مربوط کرنے میں کافی نقصان پہنچایا ہے۔۔ باوجود اس کے کہ چین دنیا میں سب سے زیادہ آلودگی پھیلا رہا ہے، وہ فری ٹریڈ کا اس وقت کا فاتح بنا ہوا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ چین نے اپنی معیشت کو ایک خوبصورت بیوروکریسی کی شکل میں بڑا دیدہ زیب شکل میں رکھا ہوا ہے، ایک طاقتور اسٹیٹ کی شکل میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں بھی شامل ہے، ان سب کے باوجود چین نے ان منصوبوں کو ایک مبہم مگر جاذب، باہمی تعاون اور انسان دوست شکل میں پیش کر کے اپنے آپ کو ایک فلاحی راہنما ثابت کرنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۰

سعودی عرب: سرمایہ کاری کس قیمت پر؟

Frank Vogl

سعودی حکمران شدید بدحواسی کے عالم میں ہیں۔ مستقبل بہت تابناک دکھائی دے رہا تھا، مگر اچانک منظر نامہ تبدیل ہوگیا ہے۔ بہت کچھ ہے جواب نہیں ہے۔ کہاں تو سعودی عرب عالمی معیشت میں ایک قابلِ رشک مقام کی طرف بڑھ رہا تھا اور کہاں یہ حالت ہے کہ سرمایہ کاروں کو متوجہ کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے، چینیوں کے عزائم کے حوالے سے اضطراب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوری طور پر سرمایۂ سیّال کی ضرورت ہے۔

سعودی حکمرانوں کو بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ اب تیل کے سہارے زیادہ دن اچھی طرح نہیں گزارے جاسکتے۔ وہ تیل کے بعد کی معیشت کے لیے تیاری کر رہے ہیں۔ سعودی عرب کا معیشتی ڈھانچا تبدیل کرنے کی بھرپور کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ملک میں نئے منصوبے شروع کیے جا رہے ہیں اور ان منصوبوں کے لیے عالمی مارکیٹ میں سرمایہ کار تلاش کرنے کا عمل بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان اور ان کے مشیروں کے لیے ایک بڑا امتحان ''آرامکو'' کی نجکاری ہے۔ سرکاری شعبے کی اس دیوہیکل کمپنی کو اب عوام کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ کمپنی کے شیئرز عوام کو فروخت کر کے بڑے پیمانے پر سرمائے کا اہتمام کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔

سعودی معیشت کا مکمل دارو مدار تیل کی آمدن پر رہا ہے۔ عالمی منڈی میں تیل کی نچلی قیمتوں سے سعودی معیشت کو غیر معمولی دھچکا لگا ہے۔ سعودی بجٹ کا خسارہ ۸۰/ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ سعودی معیارات کے اعتبار سے بھی یہ خسارہ ایسا نہیں کہ زیادہ دن برداشت کیا جاسکے۔

ولی عہد محمد بن سلمان نے وژن ۲۰۳۰ء کے تحت سعودی معیشت کو ایک مکمل نیا چہرہ دینے کی تیاریوں کا آغاز کر دیا ہے۔ نیا شہر ''نوم'' کے نام سے بسایا جا رہا ہے۔ اس شہر میں جن منصوبوں کی تیاری کی جا رہی ہے ان پر مجموعی طور پر کم و بیش ۵۰۰/ارب ڈالر خرچ ہوں گے۔ حال ہی میں ریاض میں ۳ ہزار سے زائد متوقع سرمایہ کاروں کو مدعو کیا گیا۔ محمد بن سلمان اور ان کے مشیر سرمایہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنا چاہتے ہیں تاکہ سرمایہ کاری کا مرحلہ جلد از جلد زیادہ سے زیادہ آسان ہو جائے۔

فی زمانہ سرمایہ کاری جغرافیائی حدود کی پابند نہیں۔ اور لگائے جانے والے سرمائے کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ مگر ایک مشکل یہ ہے کہ سرمایہ کاروں کا ذہن بہت تیزی سے تبدیل ہوتا ہے۔ وہ آج آپ کے ساتھ ہیں اور کل کسی اور کے ساتھ۔ انہیں کسی بھی چیز کا حتمی طور پر پابند نہیں کیا جاسکتا۔

برطانوی اخبار فائنانشل ٹائمز نے لکھا ہے کہ محمد بن سلمان نے حال ہی میں ملک کے امیر ترین افراد کو بدعنوانی کے خلاف تحقیقات کے نام پر گرفتار کیا ہے اور رہائی کے لیے شرط یہ رکھی ہے کہ وہ اپنی ۷۰ فیصد دولت سے دستبردار ہو جائیں! اس صورت میں نوم پروجیکٹ کے لیے کم و بیش ۱۰۰/ارب ڈالر جمع کیے جاسکیں گے۔

بدعنوانی کے خلاف مہم کے نام پر ملک کے امیر ترین افراد کو گرفتار کر کے محمد بن سلمان نے جو اقدام کیا ہے، وہ سرمایہ کاروں کو تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ سعودی عرب میں سرمایہ کاری دانش مندی کا مظہر ہوگی بھی یا نہیں۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انہیں اپنی سرمایہ کاری پر کنٹرول حاصل ہوگا یا نہیں۔ بیرونی سرمایہ کار یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سعودی عرب میں سرمایہ کاری کریں اور کل کو کسی بھی سیاسی تبدیلی کے ہاتھوں انہیں اپنے سرمائے سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ سرمایہ کاری یقینی بنانے کے لیے اعتماد کی فضا ناگزیر ہے۔ جہاں اعتماد نہ ہو وہاں کسی بھی پیش رفت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

سعودی عرب میں سرمایہ کاری کی خواہش رکھنے والے سرمایہ کاروں کا اعتماد اس لیے بھی مجروح ہوا ہے کہ بدعنوانی کے خلاف مہم کے نام پر جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان میں شہزادہ الولید بن طلال اور دیگر بڑی کاروباری شخصیات بھی شامل ہیں، جو مغربی دنیا میں غیر معمولی سرمایہ کاری کرتی آئی ہیں اور ان کے اسٹیکز بہت زیادہ ہیں۔

ناروے میں آزاد فنڈز کی نگرانی پر مامور بینک ''نارجز بینک'' کے اثاثوں کی مالیت کم و بیش ایک ہزار ڈالر ہے۔ یہ بینک عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ نارجز بینک کا کہنا ہے کہ عالمی منڈی میں خام تیل کے نرخ ابھی کئی سال تک بہت ہی نچلی سطح پر رہیں گے۔ یہ بات سعودی عرب کے لیے غیر معمولی تشویش کا باعث ہے۔ سعودی حکمرانوں کو اندازہ ہو چکا ہے کہ تیل کی دولت پر عیش کرنے کا زمانہ ہوا ہو چکا۔ اب اگر خوشحالی و ترقی کو یقینی بنائے رکھنا مقصود ہے تو لازم ہے کہ آمدن کے دیگر ذرائع یقینی بنائے جائیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کے ذریعے نوم پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ دنیا بھر سے سرمایہ کاروں کو مدعو کیا جا رہا ہے تاکہ یہ منصوبہ ڈیڈ لائن کے مطابق مکمل ہو اور سعودی معیشت معتد بہ حد تک استحکام سے ہم کنار رہے۔

صورتِ حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے نارجز بینک نے ایگزون موبل، شیل اور برٹش پٹرولیم جیسی بڑی تیل کمپنیوں میں اپنے تمام اسٹاکس فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان اسٹاکس کی مالیت کم و بیش ۳۵/ارب ڈالر ہے۔ عالمی منڈی میں تیل کے کم نرخ سعودی عرب کی آرامکو سمیت دنیا بھر کی آئل کمپنیز کے اسٹاکس کی قدر میں شدید کمی کا باعث ہیں۔ سعودی عرب کا حکمراں طبقہ ابتدائی مرحلے میں آرامکو کے پانچ فیصد تک شیئرز فروخت کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس صورت میں کم و بیش ۱۰۰/ارب ڈالر جمع کیے جاسکیں گے۔

نیویارک اور لندن کی اسٹاک مارکیٹس ہی اتنی بڑی اور فعال ہیں کہ آرامکو جیسی کمپنی کے شیئرز کی فروخت کو ڈھنگ سے ڈیل کر سکیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہاں شفافیت کا تقاضا کیا جاتا ہے اور گورننس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے جبکہ سعودیوں نے اب تک معاملات کو سات پردوں میں رکھا ہے اور شکوک و شبہات کو پیدا ہونے اور پنپنے کا موقع دیا ہے۔ سعودی چاہتے ہیں کہ لندن، زیورخ اور نیویارک میں اپنی تمام پرائیویٹ ایکویٹی بھی جمع کر لیں اور پرائیویٹ انویسٹمنٹ بینکرز سے ذاتی مراسم کو بھی بروئے کار لا کر کوئی ایسا انتظام کریں کہ بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ آتا رہے۔ مگر اس کے لیے انہیں بنیادی طور پر بھرپور اعتماد کی فضا پیدا کرنا ہوگی۔ جب تک اعتماد کی فضا پیدا نہیں ہوگی تب تک سرمایہ کار نوم پروجیکٹ میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لیں گے۔

ذرائع کہتے ہیں کہ چین نے آرامکو کے شیئرز خریدنے میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ اس بات کا واضح اشارہ ہوگا کہ چینی قیادت سعودی عرب میں سرمایہ کاری بڑھانے کے ساتھ ساتھ عالمی معاشی و مالیاتی محاذ پر اپنی پوزیشن مزید مستحکم کرنے کی خواہش مند ہے۔ ہاں، پریشانی کا

باقی صفحہ نمبر ۱۰

ترجیحات

خورشید ندیم

ترجیحات کا تعین طے کرتا ہے کہ آپ کی منزل کیا ہے؟

ایک ہفتے کے لیے جرمنی میں ہوں۔ کچھ دیر پہلے ارفرٹ (Erfurt) سے واپسی ہوئی۔ دن یہاں کی یونیورسٹی میں گزارا جہاں پاکستانی نژاد ڈاکٹر جمال ملک کی سربراہی میں، مسلمانوں کی مذہبی وتمدنی تاریخ کے مطالعہ کے لیے ایک شعبہ قائم ہے۔ پاکستان، ایران اور بنگلا دیش سمیت کئی ممالک کے طلبہ و طالبات ابلاغیات، فلسفہ، لسانیات، ادب اور الٰہیات سمیت کئی اہم موضوعات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر جمال ملک ۵۸ برس سے جرمنی میں ہیں مگر پاکستان کا ذکر 'وطنِ عزیز' کے طور پر کرتے ہیں۔ حسین محمد جیسے پی ایچ ڈی کے کئی طالب علموں کے ساتھ طویل نشست رہی۔ ان کی علمی استطاعت قابلِ رشک تھی۔

ارفرٹ اپنے اندر صدیوں کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی میں مارٹن لوتھر نے پڑھا اور اس شہر میں رہ کر اپنا علمی کام کیا۔ سماجی علوم کے عظیم عالم اور فلسفی میکس ویبر کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔ ارفرٹ یونیورسٹی کی لائبریری میں ایک گوشہ ڈاکٹر این میری شمل کے متروکات کے لیے وقف ہے۔ وہ خود اپنی اسناد، ڈائریاں، کتب اس لائبریری کو دے گئی تھیں۔ یہاں ان کے وہ اعزازات رکھے ہیں جو حکومتِ پاکستان نے ان کو دیے۔ ان کی ڈائری میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی آٹوگراف نما ایک تحریر بھی دیکھی، جس کے ساتھ ۱۹۶۲ء کی تاریخ درج تھی۔

ایک دن پہلے برلن کی ایک یونیورسٹی میں 'شعبہ برائے مطالعہ جدید استشراق' (Centre of Modern Oriental Studies) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں ڈاکٹر ریٹز (Dr Dietrich Reetz) اور ان کے شعبے کی دو خواتین محققین سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اہلِ علم کا یہ حلقہ 'جنوبی ایشیا میں اسلام' کو اپنی علمی سعی و جہد کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ریٹز کا موضوع ''دیوبند کی علمی وفکری تاریخ'' ہے۔ اس موضوع پر ان کی معلومات کی وسعت اور تازگی حیرت انگیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آج دارالعلوم دیوبند میں کیا ہو رہا ہے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مولانا فضل الرحمٰن کا تازہ ترین سیاسی موقف کیا ہے۔

منگل کو برلن برانڈنبرگ اکیڈمی آف سائنسز' جانا ہوا۔ یہاں محققین کی ایک جماعت تاریخِ قرآن مجید پر کام کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کو تین دائروں تک پھیلا رکھا ہے۔ ایک: متن کی تاریخ جس میں وہ قدیم ترین نسخوں تک رسائی کی کوشش میں ہیں اور انہوں نے کئی نایاب نسخہ دریافت بھی کیے ہیں۔ دوسرا: نسخوں کا باہمی مطالعہ اور تیسرا: تفسیر ہے، جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ قدیم آسمانی صحائف اور قرآن مجید کی تعلیمات یا واقعات کے بیان میں کہاں فرق اور کہاں ہم آہنگی ہے۔

اس ٹیم میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ ایک سے میں نے جب اس کے نتائجِ تحقیق کے بارے میں پوچھا تو اس کا کہنا تھا کہ یہ علمی منصوبہ ان اعتراضات کو ختم کر دے گی جو مستشرقین کی جانب سے قرآن مجید کی تاریخی حیثیت پر کیے جاتے ہیں۔ اب تک اس کا غیر منقطع تاریخی تسلسل سامنے آیا ہے۔

جرمنی کے علمی اداروں اور یہاں موجود محققین کے علمی انہماک نے مجھے بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ یہ بے چینی کئی سوالات میں ڈھلتی گئی:

۱۔ مغرب کی ترقی کا راز، کیا اس کی علم دوستی ہے؟

۲۔ رسوخ فی العلم کیا محض کھیل تماشا ہے؟

۳۔ ہمارے ملک میں ایسی علمی روایت کیوں مستحکم نہیں ہو سکی؟

بظاہر اُن موضوعات کا جرمنی یا جرمن قوم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، جن پر ان اداروں میں تحقیق ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ ان پر وسائل خرچ کر رہے ہیں اور خلوت میں بیٹھے لوگ ان موضوعات پر دادِ تحقیق دے رہے ہیں جن سے انہیں کوئی براہ راست فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ یہ وسائل صرف حکومت نہیں، وہاں کے امرا اور نجی شعبہ بھی فراہم کر رہا ہے۔ قدیم جرمنی اور یورپ میں اکیڈمیوں کا تصور موجود تھا۔ یہ ان لوگوں نے قائم کیں جو علم دوست تھے۔ یہ اکیڈمیاں مختلف تحقیقی و علمی منصوبوں کے لیے وسائل فراہم کرتی تھیں۔ اسی طرح وقف کا تصور تھا۔ کوئی امیر آدمی مرتا تو اپنی دولت علمی ترقی کے لیے وقف کر جاتا۔ یہ ادارے آج بھی کام کر رہے ہیں۔ مطالعہ استشراق کے لیے قائم ادارے کو ایسی ہی ایک اکیڈمی وسائل فراہم کر رہی ہے۔

بظاہر جرمنی سے غیر متعلق دکھائی دینے کے باوجود، ان تحقیقی منصوبوں سے دو باتیں بڑی واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اِس کے نتیجے میں، جنوبی ایشیا پر تحقیق کرنے والے جرمنی کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یوں یہ تحقیق اس خطے میں جرمنی کے بارے میں سفارت کاری کا کام سرانجام دے گی۔ دوسرا یہ کہ علم کے لیے دنیا ان موضوعات پر جرمنی کی محتاج ہو گی۔ کل ریاستی سطح پر جو پالیسی بنے گی، اس کی بنیاد آج کی اس تحقیق پر ہو گی۔ یوں امامت کا منصب جرمنی کے پاس ہو گا۔ آج جسے ہم مغربی فلسفہ کہتے ہیں، اس کا مرکز جرمنی ہے۔ کانٹ، ہیگل، مارکس، اینجلز، گوئٹے ان سب کا تعلق جرمنی سے تھا۔

ایسا علمی کام صرف جرمنی نہیں، ترقی یافتہ دنیا کے ہر حصے میں ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا کی قیادت ان اقوام کے ہاتھ میں ہے۔ برتری کا پیمانہ علم ہے۔ جو قوم علمی برتری رکھتی ہے، لازم ہے کہ امامت کا منصب بھی اسی کے پاس ہو۔ جرمنی جیسے ممالک اس راز کو جانتے ہیں۔ اس لیے علمی تحقیق اور غور و فکر پر بے پناہ وسائل خرچ کرتے ہیں اور آج اسے اپنی ترجیح بنائے ہوئے ہیں۔ یقیناً اس کے ساتھ معاشی مفادات وابستہ ہیں لیکن وہ ضمنی، بلکہ اس مقصد کے مقابلے میں حقیر ہیں۔

میں نے اس سفر میں یہ بھی جانا کہ رسوخ فی العلم کھیل تماشا نہیں۔ یہ پتّا ماری کا کام ہے۔ علم جب تک طویل عرصہ خلوت میں نہ گزارے، اس کی نمو نہیں ہو سکتی۔ اسے شعوری طور پر اپنی ترجیح بنانا پڑتا ہے۔ طویل ریاضت کے بعد ہی علم اپنی کرامت دکھاتا ہے۔ معاشرہ جب تک علم دوستی کو بطور قدر اختیار نہیں کرتا، ''**راسخون فی العلم**'' پیدا نہیں ہوتے۔

پاکستان میں علم دوستی کی قدر مستحکم نہیں ہو سکی۔ جہالت کو بطور علم پذیرائی ملی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرہ سنگ ریزے اور ہیرے میں فرق کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ لوگ ان امور پر ماہرانہ رائے دیتے ہیں جن کے ابجد سے واقف نہیں ہوتے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے حوالہ بنا دیا جاتا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ علم کی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل کبھی ہماری ترجیح نہیں بن سکی۔ مذہب، سیاست، صحافت، ہر شعبے میں موجود لوگوں کی ترجیحات پر ایک نظر ڈالیے۔ کہیں علم دکھائی نہیں دے گا، الّا ماشاء اللہ۔ اہلِ مذہب میں، جن کا بظاہر علم سے کوئی راہ و رسم ہے، انہیں بھی یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اگر کوئی علم کی بات کرتا ہے تو اس کا منہ کیسے بند کیا جائے۔ اس کے لیے آزمودہ نسخہ کسی پر کوئی لیبل چسپاں کر دینا ہے۔ دیگر کے احوال تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے شعبوں کا ہے۔ آج سیاست کے میدان

باقی صفحہ نمبر ۱۰

یومِ شکست نہیں، یومِ تشکر

محمد عامر خاکوانی

دھرنا ختم ہوا، عوام نے سکھ کا سانس لیا، بیشتر کو خدشہ تھا کہ کہیں تصادم خونی نہ ہو جائے۔ مولوی خادم رضوی اپنے ساتھیوں سمیت گھروں کو لوٹ گئے۔

فیض آباد والا دھرنا ختم ہوا تو ایک دوست کا ٹیکسٹ پیغام آیا ''ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے، تمت بالخیر''۔ یہ دوست مذہبی تنظیموں اور مذہبی جماعتوں کے حامی نہیں، خادم رضوی صاحب کی آتش فشاں گفتار کے باعث ان سے سخت ناخوش تھے، اس کے باوجود انہیں دھرنے کے خلاف وحشیانہ حکومتی آپریشن اور میڈیا کے بدترین بلیک آؤٹ پر صدمہ پہنچا۔ بات ہوئی تو کہنے لگے ''یہی دعا ہے کہ معاملہ زیادہ نہ بگڑے، کہیں ایسا نہ ہو کہ فیض آباد میں کوئی المناک سانحہ ہو جائے اور پھر تلافی کی کوئی صورت ہی نہ رہے''۔ اس طرح کا ردعمل ہر جگہ دیکھا جا رہا تھا۔ لوگوں کی اکثریت دل و جاں سے یہ چاہتی تھی کہ ڈیڈ لاک ختم ہو جائے اور جانی نقصان سے بچا جائے۔ حیرت اس پر ہے کہ پچھلے تین چار دنوں سے وطن عزیز کے بعض حلقے ایسے بھی ہیں جو صف ماتم بچھائے ہیں۔ کئی نامی گرامی تجزیہ کار منہ سے کف اڑاتے ہوئے شعلے برسا رہے ہیں۔ ایک خاتون جو ماتھے پر بندیا لگانے کی شائق ہیں ذہنی طور پر وہ خود کو بھارتیوں سے قریب پاتی ہیں، قومی چینلز پر مذہب اور مذہبی حلقوں کے خلاف زہر اگلنا انہیں از حد مرغوب ہے۔ بی بی نے ایک ازکار رفتہ انگریزی اخبار میں چیختا چنگھاڑتا مضمون لکھا، جس میں اس معاہدے کو سقوطِ پاکستان سے تشبیہ دی۔ ان کے خیال میں ریاست نے ۱۹۷۱ء کی طرح ایک بار پھر سرنڈر کر دیا۔ اس حلقہ فکر سے تعلق رکھنے والے دیگر ممتاز لبرل، سیکولر افراد بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ انہیں شدید صدمہ پہنچا کہ ریاست نے اپنی قوت استعمال کرتے ہوئے اس مٹھی بھر گروہ کو ''خاک'' میں کیوں نہ ملا ڈالا اور معاہدہ کے ذریعے پُرامن حل کیسے نکل آیا؟

آدمی حیرت سے سوچتا ہے کہ یہ لوگ کس دنیا کے باسی ہیں۔ کیسے لوگ ہیں جو ایک طرف مغربی اخلاقیات کے مطابق کتوں کو انسانوں سے زیادہ عزیز جانتے اور حیوانات کے لیے قوانین بنانے کے حامی ہیں، دوسری طرف انہیں اندازہ نہیں کہ مغرب میں انسانی جان کی کیا اہمیت ہے اور ہر قیمت پر ایسے کسی سانحے سے بچنے کی سعی کی جاتی ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ کیسی قیامت ٹل گئی اور اگر خدانخواستہ وہ احمقانہ آپریشن جسے اس صدی کے عظیم ترین ''دانشور'' اور بدقسمت پاکستانی قوم کے وزیر داخلہ پروفیسر احسن اقبال نے ترتیب دیا، اگر وہ کامیاب ہو جاتا اور فیض آباد میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تو ملک کے ہر گلی کوچے میں کیسا خونریز احتجاج شروع ہو جاتا۔ اس پورے نظام کی چُولیں ہل کر رہ جاتیں۔ دھرنا ختم ہونے پر تین طرح کے لوگ ناخوش ہوئے۔ سب سے زیادہ صدمہ سیکولروں کو پہنچا۔ ایک بار پھر یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ملک میں ختم نبوتؐ کے حوالے سے قوانین میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتا، درحقیقت اب تو اس بارے میں سوچنے کی جرأت بھی کوئی سیاسی جماعت نہیں کرے گی۔ ہمارا لبرل، سیکولر کیمپ ہمیشہ سے توہین رسالت قانون اور احمدیوں کے غیر مسلم ہونے کی آئینی ترمیم پر ناخوش رہا۔ مختلف حیلوں، بہانوں سے یہ ان آئینی ترامیم پر تنقید کرتے آئے ہیں، سوال اٹھانے کے بظاہر معصوم مطالبے کے پیچھے بھی یہی سوچ کارفرما ہے کہ کسی طرح ان ایشوز کو دوبارہ سے زیر بحث لایا جائے۔ دھرنے نے اس امکان کو ہمیشہ کے لیے نہ سہی، خاصے عرصے کے لیے دفن کر دیا ہے۔ خالص مذہبی سوچ رکھنے والے کسی گروہ کا احتجاج کامیاب ہوا اور وہ اپنے مطالبات منوانے میں کامران ٹھہرے، یہ بات بھی لبرل سوچ رکھنے والوں کے لیے ذہنی اذیت کا باعث ہے۔ دوسرا بڑا حلقہ جسے شدید مایوسی ہوئی وہ مسلم لیگ ن کے سیاسی اور صحافتی ساتھی ہیں۔ ن لیگ کو سپورٹ کرنے والوں کو دو اعتبار سے دھچکا پہنچا۔ ایک تو (ن) لیگی حکومت کی نااہلی اور نان گورننس بُری طرح ایکسپوز ہوگئی۔ وزیر داخلہ احسن اقبال جسے مسلم لیگی مُدبّر بنا کر پیش کرتے تھے وہ پرلے درجے کے نااہل، ویژن سے عاری شخص نظر آئے۔ وزیراعظم سمیت پوری کابینہ میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ایشو کو ہینڈل کر پاتا۔ پنجاب حکومت کی خودغرضی اور نالائقی ایک بار پھر آشکار ہوگئی، جس نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے مظاہرین کو اسلام آباد پہنچنے دیا۔ میڈیا میں جو لوگ ن لیگ کی ترجمانی کر رہے ہیں یا ان کا مقدمہ لڑنے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں، ان کے لیے دھرنے کی مس ہینڈلنگ، ناکام آپریشن اور میڈیا کے شرمناک بلیک آؤٹ کا دفاع کرنا مشکل ہوگیا۔ ن لیگ کو بڑا دھچکا یہ لگا کہ لبیک یا رسول اللہ تحریک کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ آئندہ انتخابات میں یہ تنظیم پنجاب کی چالیس پچاس قومی اسمبلی اور نوے پچانوے صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر (ن) لیگ کو ہرانے کا باعث بن جائے۔ تیسرا وہ حلقہ ہے جو فوج یا اسٹیبلشمنٹ کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ ان کے نزدیک ملک کی تمام تر خرابیوں کی ذمہ دار پاک فوج ہے اور اسے ہر صورت مطعون کرتے رہنا چاہیے۔ دھرنے کی کامیابی سے پاک فوج سرخرو ہوئی اور اس کا امیج بہتر ہوا۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ فوج مظاہرین پر گولیاں چلا کر عوامی نفرت کا سامنا کرے گی، انہیں یہ افسوس ہے کہ آرمی چیف نے مداخلت کرا کر یہ معاہدہ کیوں کرا دیا؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنرل کیانی کی مداخلت سے میاں نواز شریف نے لانگ مارچ روکا اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے ججوں کی بحالی کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت کسی مسلم لیگی دانشور یا لکھاری نے نہیں کہا کہ فوج نے کیوں ثالثی کرائی، حالانکہ وہ تو سول حکومت کے ماتحت ہے، اسے تو وفاقی حکومت کے حکم کے تحت لانگ مارچ روکنا چاہیے تھا۔ اس کے بجائے ان سب نے فوج اور اس وقت کے آرمی چیف کو خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے عدلیہ کی بحالی کی راہ ہموار کی اور یوں ملک بڑے تصادم سے بچ گیا۔ اس بار چونکہ فوج کی اس ثالثی سے مسلم لیگ ن کو سیاسی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس کی نااہلی واضح ہوئی اس لیے فوج ہدفِ تنقید ہے۔

فیض آباد کا دھرنا ختم ہونا یقیناً خوشگوار رہا کہ ملک سے غیر یقینی، کنفیوژن اور خوف کے بادل چھٹ گئے۔ ابتدائی آپریشن میں جانی نقصان تو ہوا لیکن اگر فوج کو آپریشن کرنا پڑتا تو لال مسجد کی لہو رنگ کہانی دہرائے جانے کا خدشہ تھا۔ اس اعتبار سے بچت ہوگئی اور قیمتی جانیں بچ جانے کی ہر ایک کو خوشی ہوئی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ریاست اس ایشو میں ناکام ہوئی۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ملک کے چار ستون ہیں۔ پارلیمنٹ، عدلیہ، حکومت اور عوام..... اور یہ چاروں ستون ناکام ہوئے اور ریاست کو رسوائی اٹھانا پڑی، اسے یوم شکست کہا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے خیال میں ایسا نتیجہ نکالنا درست نہیں، دراصل یہ نری جذباتیت ہے۔ اسے مزید گہرائی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ درست ہے کہ

باقی صفحہ نمبر ۱۲

طُرفۂ معجونی

منیر احمد خلیلی

شاعری اگر ایمان سے مستنیر نہ ہو، ایمان کی روشنی میں اسے اگر عمل کی صحیح جہت نہ ملی ہو اور شاعر کے دل کی کھیتی اگر اپنے رب کی یاد سے سیراب نہ ہوتی ہو تو یہ کجی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس میں یکسوئی اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا ہے۔ مختلف وادیوں میں بھٹکتی اور بھٹکاتی ہے۔ مجرّد شعر و ادب کو رہنما بنانے والوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ خواہ دانش کی کتنی ہی بلندیوں کو چھو رہے ہوں مگر ان کے فکر و عمل میں کہیں نہ کہیں کوئی ٹیڑھ موجود رہتا ہے۔ یہ معاملہ ان کی ذات اور فکر تک محدود نہیں رہتا۔ شاعروں اور ادیبوں کے مداح ان کی فکر کی کجی کو دلیل بنا لیتے ہیں۔ یوں فکر کا یہ بگاڑ پہلے حجت بنتا ہے پھر اسے نظریہ کی شکل دی جاتی ہے۔ اجتماعی شعور اگر اس نظریے کی گرفت میں آ جائے تو پھر اس نظریے کو لائحہ عمل بنانے اور پوری زندگی پر مسلط کرنے کی کوشش ہونے لگتی ہے۔ شاعر اور ادیب اکثر اپنی کاہلی اور بے عملی کی وجہ سے خود اس قابل نہیں ہوتے کہ کسی نظام میں ڈھال کر اس ٹیڑھ زدہ فکر کو لائحہ عمل کا درجہ دلا سکیں لیکن اس کا پرچار جاری رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اقبالؒ شعر و ادب کی اس صف میں نہیں تھے۔ نکالنے والے ان کی شاعری اور نثری افکار سے اپنے مطلب کی باتیں نکالتے رہتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ کی شاعری پر قرآن کا رنگ غالب ہے۔ اسلام اللہ کا دیا ہوا دینِ حق اور نظامِ حیات ہے۔ اس کی روح میں آفاقیت ہے۔ یہ حدودِ عرب و عجم اور جوانبِ شرق و غرب سے آزاد ہے۔ اقبالؒ نے جس کے بارے میں اور جس وجہ سے بھی عجم ہنوز نداند رموزِ دین.....، والی بات کی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہیں احساس تھا اور اس کے عملی نظائر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں کہ عجم کے فہم دین نے صرف وطنیت اور قومیت کے بارے میں نہیں بلکہ اسلام کے بہت سے معاشرتی، معاشی، معاملاتی اور اخلاقی پہلوؤں سے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نجی اور سماجی زندگی میں اپنے مفادات اور ضرورتوں کے تحت اسلامی فکر میں من پسند آمیزشیں کی گئیں۔ اسلام کو زبردستی 'مقامی' بنانے کی کوشش ہوئی تو انجام کار یہ اجنبی بن کر رہ گیا۔ جب اس کے شفاف چہرے پر مقامی رسوم و رواج کا رڈا چڑھ جاتا ہے اور اپنے مرغوب تصورات و بدعات اور رسوم و رواج سے آلودہ اسلامی چہرے میں لوگوں کو کشش محسوس ہونے لگتی ہے تو پھر ان کے سامنے اسلام کی اصل اور حقیقی شکل پیش کریں تو وہ الٹا اس اصل شکل کو بدعت اور نقل قرار دیتے ہیں۔

آج کل ترکی سے حکومتی سطح پر بھی رومانس چل رہا ہے اور مختلف اسلامی تنظیموں کے نمائندے اور دینی شخصیات کے علاوہ صحافیوں اور دانشوروں کی ڈاروں کی ڈاریں بھی ترکی یاترا پر جاتی اور وہاں سے اپنے اپنے ذوق کی حکایتیں لاتی ہیں۔

بات بات پر ترکی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ درویشانہ قونیہ کے دیدارِ رقص کی لذتوں کا نشہ پی کر آتے ہیں تو پھر حکایتوں کی صورت میں اس کے جام پر جام یہاں بانٹے جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ فکری، اخلاقی اور عسکری زوال کا شکار ہو جانے کے بعد سترہویں یا اٹھارہویں صدی کے کس عثمانی خلیفہ کے عہد میں اہم ملکی اور سرکاری مہموں کا آغاز کرتے وقت بخاری شریف کے ختم کی روایت قائم ہوئی تھی۔ ایک بار بحری جہاز کو سمندر میں اتارنے کا مرحلہ آیا تو اسی روایت کے مطابق بخاری شریف کا ختم کرایا گیا۔ کسی مغربی حریف نے یا اپنے ہاں کے کسی صاحب عقل نے طنزاً کہا تھا کہ بحری جہاز بخار (Steam) سے چلتے ہیں، بخاری سے نہیں۔ یہ مثال میں نے اس لیے دی ہے کہ ترکی کے اندر دین میں عجیب عجیب بدعتوں کی آمیزش کئی سو سال پہلے سے سلاطین اور نام نہاد شیخ الاسلام قسم کی ذہنی اپج سے شروع ہو گئی تھی۔ آجکل کسی ترک رہنما کی سید منور حسن یا مرحوم قاضی حسین احمد کو کہی ہوئی یہ بات بہت دہرائی جا رہی ہے کہ نعوذ باللہ ہم نے کمال ازم کا مقابلہ بدعتوں کے ذریعے کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی، برائی کو بھلائی سے رفع کرو''۔ لیکن یہاں لذت چشیدگان عجم کا موقف ہے کہ کیونکہ ہمارے دوست ترکوں نے کمال ازم کی برائی کو بدعتوں کی برائی سے دفع کیا اس لیے ان کے کہے کو ایک دائمی اصول کا درجہ دے کر رسول اللہؐ کی کُلُّ بِدْعَۃ ضَلَالَۃٌ کی تنبیہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے کے 'ترکی سنت' کو دین کا حصہ بنا لینا چاہیے۔ جدید ترکی پر دینی اعتبار سے سب سے زیادہ اثرات بدیع الزماں نورسیؒ کے ہیں۔ فتح اللہ گولن ہوں یا طیب اردوان اور عبداللہ گل، سب نورسیؒ کی عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ میرے پاس بدیع الزماں نورسیؒ کے 'رسائل' اور دیگر ملفوظات کے جتنے مجموعے ہیں ان میں اگرچہ نقشبندی سلسلہ تصوف کے تذکرے ملتے ہیں لیکن ان کی دعوت کی روح قرآن ہے۔ وہ ہمیں رجوع الی القرآن کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

حالیہ عرصے میں کچھ انوکھے مباحث سامنے آ رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی کو 'مذہب عشق' کا موسس قرار دیا گیا اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ علم کو نمائندہ ثابت کیا جا رہا ہے۔ دین میں عشق، عقل اور علم باہم متغائر و متصادم اکائیاں نہیں ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی دور کی یہ تینوں ہستیاں اعتقادی اور عملی میدان میں تین مختلف سمتوں میں امت کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ معاشرتی قدروں میں رکھ رکھاؤ اور رواداری اور احترام کے رویوں کی وجہ سے انہوں نے اختلافات کو مخالفت میں بدل کر ایک دوسرے کے خلاف کوئی محاذ کھڑا نہیں کیا تھا لیکن ہمیں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ یہ تینوں نقطے یگانگت اور ہم آہنگی کے خط کھینچ کر ایک مثلث کی شکل میں جوڑ دیے گئے ہوں۔ یہ تین اپنی اپنی آب و ہوا والے تین جدا جزیرے تھے۔ تینوں کے مسلمانانِ ہند پر اپنے اپنے انداز میں احسانات ہیں۔ ان کے اثرات کے اپنے اپنے الگ حلقے بن گئے۔ ہر ایک کی افتادِ طبع اور اندازِ اظہار نے معتقدات و مسالک کے الگ الگ مکتب فکر پیدا کیے۔ حضرت احمد رضا بریلویؒ تفقہ اور علمیت اور 'وارداتِ عشق رسولؐ' کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی اعلیٰ و ارفع حیثیت کے مالک تھے، مولانا قاسم نانوتویؒ کے لیے ان کے سارے مذہبی تصورات قابل قبول نہیں تھے۔ یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا۔ پُلوں کے نیچے سے ڈیڑھ پونے دو سو سالوں کا پانی گزر چکنے کے باوجود سرسید کی 'جدیدیت' کے جزیرے کی آب و ہوا دوسرے دونوں مسلکوں کے لیے سازگار نہیں بنی ہے۔

اللہ کے محبوب نبی، سرور دو عالم، امام الانبیاء، سید الابرار جناب محمد مصطفیٰ ﷺ سے عشق محبت پر نہ کسی کا اجارہ ہے اور نہ حضورؐ کی سنت و سیرت کی پیروی کے سوا اور کوئی پیمانہ ہے جس کے ذریعے یہ ناپا جا سکے کہ کون بڑا عاشق رسولؐ ہے اور کون چھوٹا عاشق ہے۔ لفظ 'عشق' کو تو اردو اور فارسی شاعری نے حب کی جگہ مستعمل عام بنا دیا اور ان شاعروں کے اپنے محبوب کے بارے میں اظہار کے جو سستے قرینے تھے اس لفظ کی وجہ سے وہی عشقِ رسولؐ کے اظہارات میں بھی جھلکنے لگے۔ کسی شخص کا مسلمان ہونے کا دعویٰ اللہ کے دربار میں قابل قبول نہیں جب تک کہ اس کے دل میں رسول اللہؐ سے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے ہر رشتے اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت نہ ہو۔ ایسے لوگوں کے فہمِ دین پر تعجب سے بڑھ کر رونا آتا ہے جو اس فلسفے کا پرچار کرتے ہیں کہ توحید پر بہت زیادہ زور دینا رسالت یا عشقِ رسولؐ کی نفی ہے۔ اگر دینِ حق اور ہدایت وہ ہے جو دے کر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا تو اس کی اساس توحید ہے۔ قرآن پاک کا کوئی

باقی صفحہ نمبر ۷

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950